سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

جو کچھ کھو یا گیا ہے اس کو بھول جاؤ
تاکہ جو کچھ باقی ہے اس کو حاصل کر سکو

فروری ۱۹۸۵ شمارہ ۹۹

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

فروری ۱۹۸۵ء ☐ شمارہ ۹۹

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے:	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بینک سے رقم بھیجتے ہوئے

ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی

'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ

سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عجیب غفلت

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اپنے زمانہ میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا — "ندوۃ العلمار کیا کر رہا ہے" اس مضمون میں انھوں نے کلکتہ کے اخبار حبل المتین (۱۰ اگست ۱۹۰۶) کا ایک اقتباس درج کیا تھا۔ یہ اقتباس "تاریخ ندوۃ العلمار" حصہ اول میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ مولانا شبلی کا اقتباس بعض ضروری اضافہ کے ساتھ حسب ذیل ہے:

"جس زمانہ میں روسی قوم بت پرست تھی، شہنشاہ روس ولادی میر (Vladimir) نے (مذاہب کی تحقیق کے لئے) ایک جلسہ طلب کیا تھا جس میں علمار اسلام کو بھی بلایا تھا۔ جو صاحب اس غرض کے لئے قازان سے تشریف لائے تھے انھوں نے اسلام کے تمام عقائد اور فلسفہ میں سے صرف یہ مسئلہ منتخب کرکے پیش کیا کہ (اسلام میں) سور کا گوشت کھانا بالکل حرام ہے۔ مورخین روس لکھتے ہیں کہ شہنشاہ روس ولادی میر (۱۰۱۵ - ۹۵۶ء) اسلام کی طرف مائل تھا اور چاہتا تھا کہ تمام قوم روس کے لئے مذہب اسلام کا انتخاب کر دے۔ لیکن قازانی عالم نے شریعت اسلام کے تمام احکام میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کرکے اس پر اس قدر زور دیا کہ شہنشاہ نے غصہ میں آکر ان کو نکلوا دیا اور عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (روس کے) ۶ کرور آدمی عیسائی ہو گئے"۔

بظاہر یہ غفلت بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ غفلت بدستور آج بھی جاری ہے۔ قازان کے عالم کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مدعو سے غیر حکیمانہ گفتگو کی جس کی وجہ سے وہ بدک گیا۔ آج کے مسلمانوں کی غلطی بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مدعو گروہوں سے بے فائدہ مقابلہ آرائی جاری کئے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مخاطبین کے دل اسلام کے بارہ میں سخت ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے دین کی طرف بلائیں۔ مگر اس کے برعکس وہ یہ کر رہے ہیں کہ اپنے لایعنی جھگڑوں سے لوگوں کو اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے۔ دنیا کی قوموں کو دین حق سے قریب کرنا تو درکنار وہ دنیا کی قوموں کو دین حق سے دور کر رہے ہیں۔ اس جرم کے ساتھ مسلمان کبھی خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

حادثات کیوں

ٹرین جب پلیٹ فارم سے روانہ ہونے والی ہوتی ہے تو سیٹی دیتی ہے۔ اس سیٹی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ اگر کچھ مسافر پلیٹ فارم پر ہوں تو وہ فوراً اپنے ڈبہ میں آ کر بیٹھ جائیں۔ تاہم اس سیٹی کو دو زاویے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ محض آواز کے معنی میں لے کر اس کو شور (Noise pollution) کہیں تو وہ بالکل بے معنی معلوم ہوگی لیکن اگر آپ اس کو "الارم" کہیں تو وہی چیز آپ کی نظر میں بالکل درست اور بامعنی بن جائے گی۔

یہی معاملہ فطرت کے حادثات کا ہے۔ فطرت کے حادثات کو دو زاویۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری زمین پر قحط، زلزلے، طوفان آتے ہیں اور دوسری قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں۔ بعض فلسفیوں نے ان کو مطلق طور پر دیکھا تو ان کو ان واقعات میں کوئی معنویت نظر نہیں آئی۔ ان کو انھوں نے مسئلہ فساد (Problem of evil) کا نام دے دیا۔

مگر پیغمبر ان واقعات کو ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ دوسرا زاویہ نصیحت اور عبرت کا زاویہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھنے میں اس قسم کے تمام واقعات فطرت کا الارم بن جاتے ہیں۔

پیغمبر کی تشریح کے مطابق یہ واقعات بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔ وہ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے سخت دن کی طرف بڑھ رہا ہے، جب کہ خدا اپنی عظیم طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ تمام انسان مجبور اور بے بس حالت میں اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اس دن آدمی بھاگنا چاہے گا مگر کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں وہ بھاگ کر پناہ لے سکے۔ اس دن آدمی مدد کے لئے پکارے گا مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو اس کی مدد کے لئے دوڑے۔

یہ واقعات جو زیادہ بڑی شکل میں قیامت میں پیش آئیں گے وہی بہت چھوٹی شکل میں موجودہ دنیا میں پیش آتے ہیں۔ وہ قیامت سے پہلے قیامت کی یاد دہانی ہیں۔ کل کے دن جو پردہ کامل طور پر پھاڑا جانے والا ہے اس کو آج ان حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

عقلمند انسان وہ ہے جو اس قسم کے واقعات کو فطرت کا الارم سمجھے نہ کہ فطرت کا بگاڑ۔ ان کو الارم کی نظر سے دیکھا جائے تو تواضع اور اصلاح کا جذبہ ابھرے گا۔ اور اگر ان کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ یہ نظام فطرت کی خرابی ہے تو اس سے ذہنی انتشار اور بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ پہلا ذہن آدمی کو جنت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا ذہن جہنم کی طرف۔

عجز کی تلافی

خدا قادر مطلق ہے اور انسان عاجز مطلق۔ خدا اور انسان کے درمیان جو تقسیم ہے وہ زیادہ اختیار اور کم اختیار کی نہیں ہے بلکہ اختیار اور بے اختیاری کی ہے۔ یہاں سارا اختیار خدا کی طرف ہے اور ساری بے اختیاری انسان کی طرف۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ایسی تخلیق کا کیا جواز ہے جس میں انسان کو حقیقی طور پر کچھ دیا ہی نہ گیا ہو۔ خدا کے لئے کیوں کر جائز تھا کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو سراسر عاجز ہوں۔ جن کو نہ اپنے آپ پر کوئی اختیار حاصل ہو اور نہ اپنے سے باہر کی دنیا پر۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف وہ ہو سکتا ہے جس میں انسان کے عجز کی کامل تلافی موجود ہو۔ کامل تلافی سے کم کوئی چیز اس سوال کا حقیقی جواب نہیں بن سکتی۔ کامل تلافی کا مطلب یہ ہے کہ جو جواب دیا جائے وہ اسی سطح پر ہو جو سوال کی سطح ہے۔ یعنی انسان کا عجز بذات خود اس کی بے اختیاری کی تلافی ہو جائے۔

اس سوال کا جواب قرآن میں اور پیغمبر کی تعلیمات میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ خدا کی یہ رحمت خاص ہے کہ اس نے صرف مانگنے کو پانے کے لئے کافی بنا دیا ہے۔ آدمی اگر حقیقی طور پر خدا سے مانگنے والا بن جائے تو یقینی طور پر وہ اپنے لئے پانے والا بھی بن جائے گا۔ انسان جب ذاتی اقتدار کا مالک نہیں تو وہ دئے ہی سے پا سکتا ہے۔ چنانچہ خدا نے اس کو اپنی طرف سے دے دیا۔ حقیقی دعا کے لئے قبولیت کی ضمانت ہونا یہی گویا اس کو دے دینا ہے۔

حدیث میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ الدعوۃ لاتُرد۔ یعنی بندہ اپنے خدا کو اگر حقیقی طور پر پکارے تو اس کی پکار کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا:

مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔ اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون سا آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اسے سانپ دے دے۔ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔

(متی ۷ : ۷ ـ

محرومی نہیں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کیس احساس مظلومی (Persecution complex) کا کیس بن گیا ہے۔ تقریباً ساری دنیا کے مسلمانوں پر کسی نہ کسی قسم کی محرومی کا احساس چھایا ہوا ہے۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ دوسری قومیں ان پر ظلم کر رہی ہیں۔ دوسری قومیں ان سے ان کی چیزیں چھینے ہوئے ہیں۔

وہ کیا چیزیں ہیں جو دوسری قومیں مسلمانوں سے چھینے ہوئے ہیں۔ وہ ہیں ـــــ سیاسی اقتدار۔ سرکاری ملازمتیں، معاشی وسائل، سماجی ادارے، مادی مفادات۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام نے ان سے انھیں محروم کر رکھا ہے۔

اگرچہ یہ "محرومی" سراسر مسلمانوں کی اپنی غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں سے حقیقۃً چھینا نہیں گیا ہے بلکہ مسلمانوں نے خود کھویا ہے۔ گویا یہ اپنی نااہلی کا کیس ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم کا۔ تاہم اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک چیز کھونے کے بعد بھی انھیں دوسری چیز حاصل ہے۔ انھوں نے "دنیا" کھوئی ہے۔ مگر "دین" اب بھی ان کے پاس پوری طرح موجود ہے۔ خدا کی آخری کتاب ان کے پاس ہے۔ خدا کا دین محفوظ حالت میں ان کے یہاں موجود ہے۔ وہ ایک ایسے زندہ رسول کے وارث ہیں جس کی نبوت ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ یہ جو چیز انھیں حاصل ہے یہ زیادہ بڑی چیز ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ چھوٹی چیز کے کھوئے جانے کا تو وہ غم کریں اور جو بڑی چیز اب بھی حاصل ہے اس کا انھیں کوئی احساس نہ ہو۔

ہمارے نزدیک دنیوی ترقی کا دروازہ بھی مسلمانوں پر بند نہیں۔ تاہم عام ذہن کے مطابق اگر یہ مان لیا جائے کہ ان پر دنیوی ترقی کے دروازے بند ہیں تب بھی عین اسی وقت آخرت کی ترقی کے دروازے ان پر کھلے ہوئے ہیں جو یقیناً زیادہ بہتر ہے اور ابدی بھی۔ پھر کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ کہ چھوٹی چیز کی محرومی انھیں تڑپائے مگر بڑی چیز کا حاصل رہنا ان کے اندر کوئی جوش پیدا نہ کرے۔

بندوں سے اگر مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے تو خدا سے ملنے کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خدا کے کام میں مشغول ہو کر خدا سے وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ پالیں جس کو وہ بندوں سے نہ پاسکے اور نہ کبھی وہ ان سے پاسکتے۔

عجیب یادگار

مسز اندرا گاندھی پہلی بار ۱۹۶۶ میں ہندستان کی وزیر اعظم بنیں۔ اس وقت ان کی سرکاری رہائش گاہ کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ صفدر جنگ روڈ (نئی دہلی) کے دو مکانات کو ملا کر ایک بڑا مکان بنا یا گیا۔ یہ وزیراعظم اندرا گاندھی کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ اس رہائش گاہ میں اور اس کے آس پاس بہت دور تک وزیراعظم کی حفاظت کے لئے انتہائی غیر معمولی حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے۔ مگر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو مسز گاندھی کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ مسز گاندھی کے حفاظتی دستہ کے دو آدمیوں (بینت سنگھ اور ستونت سنگھ) نے انھیں اسی ہتھیار کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جو وزیر اعظم کی جان کی حفاظت کے لئے انھیں خصوصی طور پر مہیا کئے گئے تھے۔

صفدر جنگ روڈ کے اس مکان کو اب مسز اندرا گاندھی کی یادگار میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے منصوبہ کو بتاتے ہوئے اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ نومبر ۱۹۸۴) میں یہ الفاظ درج تھے:

> --- that the house should be maintained people could come and pay their tributes to the memory of the most powerful woman in the world who died a martyr.

حکومت کا خیال ہے کہ اس گھر کو ایک ایسے مقام کی حیثیت سے باقی رکھا جانا چاہئے جہاں لوگ آئیں اور اس خاتون کو خراج عقیدت پیش کریں جو دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور خاتون تھیں اور یہاں ایک شہید کی حیثیت سے مریں۔

مسز اندرا گاندھی کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک ان کا ہندستان کا وزیر اعظم ہونا۔ دوسرا ان کا بے یار و مددگار انسان کی حیثیت سے مارا جانا۔ دونوں کو ملا کر دیکھئے تو مسز اندرا گاندھی کی زندگی انسان کے کمال عجز کی داستان سنا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایک وزیر اعظم بھی اتنا ہی کمزور ہے جتنا ایک معمولی انسان۔ مگر جن لوگوں نے مسز گاندھی کے پہلے رخ کو ان کے دوسرے رخ سے الگ کر کے دیکھا ان کے لئے یہ واقعہ بالکل الٹے مفہوم کا حامل بن گیا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ جو واقعہ انسانی عجز کا سبق دے رہا ہے، اس سے نادان لوگ انسانی کبریائی کا سبق لے رہے ہیں۔ جو واقعہ انسان کے بے طاقت ہونے کا ثبوت ہے اس کو اس بات کی یادگار بنایا جا رہا ہے کہ انسان کس قدر طاقت ور ہے۔

آگ سے بچاؤ

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم :
من استطاع ان یقی وجھہ من النار
و لو بشقۃ من تمر فلیفعل ۔ ومن لم یجد فبکلمۃ
طیبۃ فان بہا تجزی الحسنۃ عشر امثالہا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو
شخص اپنے چہرہ کو آگ سے بچا سکے تو اس کو چاہئے کہ
وہ ایسا کرے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ
یوں نہ ہو ۔ اور جو شخص یہ بھی نہ پائے تو وہ ایک پاکیزہ
بول کے ذریعہ اپنے آپ کو آگ سے بچائے ۔ کیوں کہ
انسان کے عمل کا خدا کے یہاں دس گنا بدلہ دیا جاتا ہے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کھجور کا ٹکڑا یا پاکیزہ بول بذات خود جہنم کی آگ سے بچنے کا سرٹیفکیٹ ہے ۔ خدا کے یہاں جو قیمت ہے وہ دراصل اس بے قراری کی ہے جس کے تحت مذکورہ قسم کے اعمال کسی بندہ خدا سے صادر ہوتے ہیں ۔

خدا انسان کی اس بے قراری کو دیکھنا چاہتا ہے جب کہ وہ جہنم کے عذاب کو سوچ کر تڑپ اٹھے اور اس سے بچنے کے لئے جو کچھ اس کے بس میں ہے اسے کر ڈالے ۔ آدمی کے سامنے ایک ضرورت مند آتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے ۔ آدمی کو اس کی بے بسی دیکھ کر آخرت میں اپنی بے بسی یاد آجاتی ہے ۔ شدت احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں ۔ وہ اپنی جیب کے چند پیسے یہ کہتے ہوئے سائل کو دے دیتا ہے کہ خدایا میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ۔ تو اسی حقیر انفاق کو میرے لئے قبول کر لے اور مجھ کو آخرت کے عذاب سے نجات دے دے ۔

اسی طرح ایک اور شخص ہے جس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو وہ اپنے بھائی کو دے ۔ مگر جب بھی موقع آتا ہے وہ دوسرے کے حق میں خیر خواہی کا کلمہ بولتا ہے ۔ اس کی زبان سے نہ گھمنڈ کے الفاظ نکلتے اور نہ حسد کے الفاظ ۔ اس کا کلام اللہ کے ڈر سے نہایا ہوا ہوتا ہے ۔ ہر موقع پر وہ وہی کہتا ہے جو عدل و انصاف کا تقاضا ہو ۔ ایسا انسان بھی دوسروں کو کچھ دے رہا ہے ۔ اس سے اس کے بھائیوں کو بہتر جذبات مل رہے ہیں ۔ وہ لوگوں کو اپنے شر سے بچائے ہوئے ہے ۔ ایسا شخص بھی ان لوگوں میں ہے جس کے لئے آخرت کے دروازے کھولے جائیں گے ۔

قرآن سے تعلق

امام شافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) کو اصول فقہ کا موسس کہا جاتا ہے۔ علم وفضل کے علاوہ دینداری اور تقویٰ میں بھی وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ان کے بارہ میں ہے کہ ـــــ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام سے اس درجہ قوی ہو جتنی اپنے زمانہ میں امام شافعی کی تھی۔

امام شافعی کی عمر ابھی دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے قرآن کا حفظ مکمل کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تین دن میں قرآن کی ایک تلاوت مکمل کرلیتے تھے۔ ان کو قرآن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ہر مسئلہ کی اصل قرآن سے معلوم ہو جائے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امت کا اجماع دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی کو یہ تلاش ہوئی کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کو بار بار پڑھتے اور کوئی ایسی آیت تلاش کرتے جس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوسکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کوشش میں امام موصوف نے ۳۰۱ بار پورے قرآن کو پڑھ ڈالا۔ بالآخر انھوں نے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کرلی۔ ایک روز وہ تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۵ پر پہنچے تو اچانک ان پر منکشف ہوا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے کی شرعی دلیل موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ چلا تو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو ہم کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام شافعی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہاں سبیل المومنین سے وہی چیز مراد ہے جس کو ہم اجماع امت کہتے ہیں۔

دور اول کے اہل ایمان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں سینکڑوں بار پورا قرآن پڑھنا پڑے۔ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ کسی چیز کے بارہ میں قرآن کا حکم دریافت نہ کرلیں۔ مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کا استعمال ان کے یہاں یا تو برکت کے لئے ہوتا ہے یا صرف تلاوت کے لئے۔

فطرت کی تلاش

ایک آدمی جس کے پاس دولت اور اقتدار ہو اس کے گرد پر رونق سازوسامان جمع رہتے ہیں۔ باہر سے دیکھنے والوں کو وہ اپنے سے مختلف بڑی چیز دکھائی دیتا ہے مگر خود اس شخص کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ جب اپنی تنہائیوں میں جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی ویسا ہی ایک کمزور انسان ہے جیسا کہ دوسرے انسان۔

امریکہ کی مشہور فورڈ کمپنی کے موجودہ وارث مسٹر الفرڈ فورڈ (۳۴) بے پناہ دولت کے مالک ہیں۔ مگر ان کی روح کوئی اور چیز پانے کے لئے بے چین تھی۔ اس دوران ان کا تعارف ہرے کرشنا مومنٹ سے ہوا جس کے مراکز امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی روح یہاں تسکین پا سکتی ہے۔ وہ اس میں شریک ہو گئے۔ مسٹر فورڈ نے ۲۷ دسمبر ۱۹۸۴ کو کرشنا مومنٹ کی ہندو لڑکی شرمیلا بھٹاچاریہ (۳۹) سے شادی کر لی۔ شادی کی یہ رسم ہرے کرشنا مومنٹ کے آسٹریلیا کے ایک مرکز میں انجام پائی۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم جنوری ۱۹۸۵) کی ایک تصویر میں مسٹر فورڈ سادھوؤں جیسے بغیر سلے ہوئے کپڑے میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اے پی کے نامہ نگار نے اس سلسلہ میں جو رپورٹ دی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

> Mr. Alfred Ford said he was only a Ford by name. "I'm not a car. I'm a spiritual soul, just like anyone else," he said.

مسٹر فورڈ نے کہا کہ وہ بس نام کے اعتبار سے فورڈ ہیں۔ "میں ایک کار نہیں ہوں۔ میں ایک روحانی وجود ہوں ویسے ہی جیسے کہ کوئی دوسرا شخص (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴)

کسی آدمی کو دولت اور اقتدار کی خواہ کتنی ہی بڑی مقدار حاصل ہو جائے، وہ اس کی ہستی کا جزء نہیں بنتی۔ سازوسامان کے ہجوم میں وہ اپنے آپ کو اکیلا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کی ہستی میں شامل ہو جائے۔ جس کو وہ اپنے داخلی وجود کی سطح پر اپنا بنا سکے۔ اس تلاش کا جواب صرف وہ کامل اور برتر خدا ہے جو انسان کا خالق اور مالک ہے۔ مگر انسان جب حقیقی خدا کو نہیں پاتا تو وہ غیر خدا میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ وہ مصنوعی طور پر اپنے اس مطلوب کو حاصل کر سکے جس کو وہ حقیقی طور پر نہ پا سکا۔

ہوشیار رہئے

حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں ۲۰ ھ میں مصر فتح ہوا۔ چار ہزار کے جس لشکر نے مصر کو فتح کیا اس کے سردار اعلیٰ حضرت عمرو بن العاص تھے۔

فتح مصر کے سلسلے میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے فتح کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی:

انتم فی رباط دائم — تمھیں ہر وقت تیار رہنا ہے

حضرت عمرو بن العاص نے بظاہر یہ بات اس وقت کے سیاسی حالات کے پس منظر میں کہی تھی۔ اس وقت کی رومی اور ایرانی حکومتیں ابھی اپنی شکست کو ہضم نہیں کر سکی تھیں۔ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ وہ کوئی موقع پاکر مسلم علاقہ پر چڑھائی کر دیں اور مسلمانوں کی فتح کو دوبارہ شکست میں تبدیل کر دیں۔

تاہم یہ نصیحت صرف وقتی نہیں۔ اس میں زندگی کی ایک ابدی حقیقت بیان ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں جس طرح نیکوں کو عمل کرنے کا موقع ہے اسی طرح برے انسانوں کی رسی بھی دراز ہے۔ یہاں جس طرح فرشتے آزاد ہیں اسی طرح شیطان کو بھی یہاں پوری آزادی حاصل ہے۔ اس لئے مومن کو ہر وقت اپنے کو دشمن کے محاذ پر محسوس کرنا چاہئے۔

مومن کو ہر وقت اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے تاکہ اس کا نفس شرارت نہ کر سکے۔ اس کو ہر وقت شیطان کی راہوں کو دیکھتے رہنا ہے کہ وہ کسی طرف سے اس کے اندر گھس نہ آئے۔ اس کو خدا کے دشمنوں سے ہر آن چوکنا رہنا ہے کہ وہ اس کی کسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے مغلوب نہ کر لیں۔

دنیا میں آدمی کو چوکیداری کی زندگی گزارنی ہے۔ اپنی چوکیداری بھی اور خدا کے دین کی چوکیداری بھی۔ اس کا بدلہ اس کو آخرت میں یہ ملے گا کہ وہاں ہر قسم کے غم اور اندیشہ سے آزاد ہو کر وہ جنت کے باغوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ تاکہ ابدی طور پر عیش و راحت کی زندگی گزارتا رہے۔

خدا کی دنیا میں

ایک نومسلم انگریز نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ۱۹۷۴ میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ یہ سفر میں نے اپنے وطن انگلینڈ سے بذریعہ موٹر کار کیا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۳ کی کوئی تاریخ تھی۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ وہاں زیورک میں میری بہن تھی جس سے مجھے ملنا تھا۔ انگلینڈ میں بائیں چلو (Keep left) کا اصول ہے اور سوئٹزرلینڈ میں دائیں چلو (Keep right) کا اصول۔ میں جب زیورک میں داخل ہوا تو مجھے یاد نہ رہا کہ یہاں مجھ کو اپنی گاڑی سڑک کے دائیں طرف چلانا چاہئے۔ سابقہ عادت کے مطابق میں سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔

جلد ہی ایک مقام پر ٹریفک کانسٹبل نے وسیل دے کر مجھے روکا۔ جب میں رکا تو وہ میرے قریب آیا۔ اس نے میری گاڑی کی پلیٹ دیکھی۔ میرا حلیہ دیکھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ انگلش آدمی ہے اور انگلش ہونے کی وجہ سے بائیں طرف گاڑی دوڑا رہا ہے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا جناب، اس وقت آپ انگلینڈ میں نہیں ہیں:

(Sir, you are not in England now)

یہ واقعہ بظاہر ایک ٹریفک کا واقعہ ہے۔ مگر اس میں آخرت کا ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ موجودہ دنیا جس میں ہم ہیں وہ خدا کی دنیا ہے۔ مگر انسان اکثر اوقات اس کو اپنی دنیا سمجھ لیتا ہے۔ وہ خدا کی مرضی کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی مرضی اور خواہش کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جس طرح سڑک کے کنارے ٹریفک کانسٹبل کھڑا ہوا لوگوں کو بتاتا ہے کہ "تم اپنے ملک میں نہیں ہو بلکہ دوسرے کے ملک میں ہو" اسی طرح خدا کے پیغمبر لوگوں کو یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ "تم انسان کی دنیا میں نہیں ہو بلکہ خدا کی دنیا میں ہو"۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اس وارننگ پر دھیان دے۔ وہ خودسری کو چھوڑ دے اور خدا کی دنیا میں خدا کے حکم کا پابند بن کر رہے۔ اس کے برعکس ناکام انسان وہ ہے جو خدا کو بھول جائے اور خدا کی دنیا میں اپنی خواہش کے رخ پر دوڑنے لگے۔

دنیا میں ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کا انجام فوراً سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے آدمی یہاں ٹریفک کانسٹبل کی وارننگ پاتے ہی اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ مگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا انجام آخرت میں سامنے آئے گا۔ اس لئے اس معاملہ میں وہ وارننگ سن کر بھی اس کی پروا نہیں کرتا مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔

سارا خون

پروفیسر پال ڈیراک (Paul Dirac) ۱۹۰۲ میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۸۴ میں انھوں نے ۸۲ سال کی عمر میں فلوریڈا میں وفات پائی۔ وہ جدید دور میں نیوٹن اور آئن سٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز سائنس داں سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو نوبل انعام اور دوسرے بہت سے اعزازات حاصل ہوئے۔

پال ڈیراک کے نام کے ساتھ کوانٹم میکانیکل تھیوری منسوب ہے۔ یہ سائنسی نظریہ ایٹم کے انتہائی چھوٹے ذرات سے بحث کرتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اینٹی میٹر کی پیشین گوئی کی جو بعد کو مزید تحقیقات سے ثابت ہوگیا۔ چنانچہ گارڈین (۴ نومبر ۱۹۸۴) نے پال ڈیراک پر مضمون شائع کرتے ہوئے اس کی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی ہے:

Prophet Of the Anti-Universe

پال ڈیراک نے ایٹم میں پہلا اینٹی پارٹیکل دریافت کیا جس کو پازیٹران (Positron) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے نیوکلیر فزکس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ لوگ جب پال ڈیراک سے پوچھتے کہ آپ نے تحت ایٹم مادہ کی نوعیت کے بارہ میں اپنا چونکا دینے والا نظریہ کیسے دریافت کیا تو وہ بتاتے کہ وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں اس طرح فرش پر لیٹ جاتے تھے کہ ان کا پاؤں اوپر رہتا تاکہ خون ان کے دماغ کی طرف دوڑے:

> When people asked him how he got his startling ideas about the nature of sub-atomic matter, he would patiently explain that he did so lying on his study floor with his feet up so that the blood ran to his head.

بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑا فکری کام وہی شخص کر پاتا ہے جو اپنے سارے جسم کا خون اپنے دماغ میں سمیٹ دے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت کو تقسیم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرکز پر یکسو نہیں کرتے اسی لئے وہ ادھوری زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ہر کام آدمی سے اس کی پوری قوت مانگتا ہے۔ وہی شخص بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے جو اپنی پوری قوت کو ایک کام میں لگا دے۔

جمہوریت کی قیمت

اسرائیل کا ایک دلچسپ واقعہ نظر سے گزرا۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے:

Worn out after an interminable meeting, a Tel Aviv company director said with a sigh, "If the children of Israel had been led by a committee instead of by Moses, they'd still be in Egypt."

تل ابیب کی ایک کمپنی کا ڈائرکٹر لا تناہی میٹنگوں سے سخت اکتا چکا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ اگر بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت موسیٰ کے بجائے ایک کمیٹی کر رہی ہوتی تو بنی اسرائیل ابھی تک مصر ہی میں ہوتے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۴)

مجلس اور کمیٹی کی بحثوں کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں کس قدر بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں۔ لفظی نکتے، دور از کار امکانات، غیر اہم پیش بندیوں پر لوگ اس قدر بحثیں کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ راقم الحروف اس دنیا میں جن چیزوں سے پناہ مانگتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اس کو کبھی کسی مجلس یا کمیٹی کا ممبر نہ بنائے۔

کوئی بڑا کام اجتماعی کوشش سے ہوتا ہے۔ اور اجتماعی کوشش میں ہمیشہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صورت کیا ہو۔ اختلاف رائے کو اتحاد عمل کے ساتھ کس طرح مطابق کیا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک شخصی اعتماد اور دوسری جمہوریت۔ اول الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے ہیں مگر بالآخر مرکزی قائد کی رائے کو تمام لوگ بلا بحث مان لیتے ہیں۔ ثانی الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ جو معاملہ پیش آتا ہے اس پر ہر شخص کی الگ الگ رائے لی جاتی ہے اور جس طرف رایوں کی کثرت ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر ثانی الذکر طریقہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں کام کم ہوتا ہے اور بحث مباحثہ زیادہ۔ اسلام میں درمیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ابتدائی مرکزی قائد کو منتخب کرنے میں عوامی رائے کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے مگر جب عوامی رائے سے ایک امیر کا انتخاب ہو جائے تو اس کو اسی طرح مکمل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جیسے موجودہ زمانہ میں امریکہ کے صدر کو۔

انسان کی تلاش

فلپ جان بائر (Philip John Bayer) امریکہ کا ایک بڑا تاجر تھا۔ وہ کویکر اسٹیٹ ریفائننگ کمپنی (Quaker State Refining Co.) کا بانی تھا۔ اس کے یہاں صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکا مرا تو اس نے بھی صرف ایک لڑکی چھوڑی جس کا نام الینر رٹشی (Eleanor Ritchey) تھا۔

الینر رٹشی کے پاس بے پناہ دولت تھی مگر وہ انسانوں سے اس قدر متنفر تھی کہ اس نے شادی نہیں کی اور تمام عمر اکیلی رہی۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۸ کو اس کا انتقال ہوا تو اس کی عمر ۵۸ سال تھی۔ انسانوں سے بے رغبت ہو کر اس نے اپنی دل چسپی کے لئے عجیب وغریب عادتیں بنا رکھی تھیں۔ مثلاً وہ کثرت سے جوتے خریدتی۔ مگر ہر جوتے کو وہ صرف ایک بار پہنتی تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں ۱۷۰۰ جوڑے جوتے موجود تھے۔ اسی طرح اس کے گھر میں اسٹیشنری کے ۱۲۲۴ بکس پائے گئے۔ وغیرہ

اس کی سب سے عجیب دل چسپی کتے تھے۔ وہ جب اپنی کار سے باہر نکلتی اور کوئی آوارہ کتا اس کو نظر آتا تو وہ پکڑوا کر اس کو اپنے گھر لاتی اور ان کو خصوصی اہتمام سے پالتی۔ اس طرح اس کے یہاں ۱۵۰ کتے جمع ہو گئے۔ اس کا گھر کتوں کی اس فوج کے لئے ناکافی معلوم ہوا تو اس نے اولاً بارہ ایکڑ اور اس کے بعد ۱۸۰ ایکڑ زمین صرف اس لئے خریدی کہ وہاں کتوں کو خصوصی اہتمام کے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا جاسکے۔

الینر رٹشی نے اپنی موت سے پہلے ایک وصیت نامہ تیار کرایا۔ اس وصیت میں اس نے لکھا کہ میری دولت میرے پالتو کتوں کے لئے وقف ہے۔ جب ایک ایک کرکے تمام کتے مرجائیں تو میری پوری دولت الباما (امریکہ) کے مدرسہ حیوانات (School of Veterinary Science) کو دے دی جائے۔

اب اس کے کتوں میں صرف آخری کتا رہ گیا ہے جس کا نام مسکٹیر (Musketeer) ہے۔ یہ تیرہ سالہ کتا اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا پاؤں کانپتا ہے اور جب وہ چھینکتا ہے تو زمین میں گر پڑتا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت جلد مرجائے گا اس کے بعد مذکورہ مدرسہ حیوانات کو بارہ ملین ڈالر کی رقم اچانک حاصل ہو جائے گی (ٹائمس آف انڈیا ۲ جنوری ۱۹۸۴)

آدمی کو اگر آئیڈیل انسان نہ ملے تو اس کو آئیڈیل نظریہ تلاش کرنا چاہئے۔ الینر رٹشی اگر ایسا نظریہ پالیتی تو انسان اس کے لئے محبت کا موضوع بن جاتا نہ کہ نفرت کا موضوع۔

حج کا پیغام

کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو اس میں تردد تھا کہ اسلامی عبادتوں میں کون سی عبادت افضل عبادت ہے۔ جب انھوں نے حج ادا کیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہوگیا کہ حج تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔

حج کی اس فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج کا تعلق ایک عظیم خدائی منصوبہ سے ہے۔ حج ایک ایسے خدائی منصوبہ کی یادگار ہے جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی آخری تکمیل ہوئی۔

حج کے مختلف مناسک اسی خدائی منصوبہ کے مختلف مراحل ہیں جن کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے۔ حاجی اپنے گھر سے نکل کر حجاز کے لئے روانہ ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر حجاز آئے۔ وہ مکہ کے قریب پہنچ کر سلے ہوئے کپڑے اتار دیتا ہے اور اپنے جسم پر دو چادریں لپیٹ لیتا ہے۔ یہ اسی قسم کی سادہ پوشاک ہے جو اس زمانہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی ہوتی تھی۔ حاجی مکہ پہنچتا ہے تو کعبہ کے گرد گھوم کر اس کا چکر لگاتا ہے۔ یہ وہی طواف ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے عہد خداوندی کی توثیق کے لئے کیا تھا۔ حاجی صفا و مروہ کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ حضرت ہاجرہ کی اس دوڑ کی نقل ہے جو انھوں نے اس بیابان میں پانی کی تلاش کے لئے کی۔ حاجی منیٰ جا کر قربانی کرتا ہے، یہ اس قربانی کا علامتی اعادہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اولاً بیٹے کے لئے اور اس کے بعد خدا کے حکم سے مینڈھے کے لئے کی تھی۔ حاجی جمرات پر جا کر شیطان کو کنکریاں مارتا ہے۔ یہ اس عمل کی یادگار ہے جو حضرت اسماعیل نے شیطان کی طرف کنکریاں مار کر کیا تھا۔ جب کہ اس نے انھیں بہکانے کی کوشش کی۔ پھر تمام حاجی عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ اس عمل کی آخری صورت ہے جو لبیک اللہم لبیک کی صورت میں ہر حاجی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں تمام حاجی کھلے میدان میں جمع ہو کر اپنے خدا سے اجتماعی عہد کرتے ہیں کہ وہ وہی کریں گے جس کا سبق انھیں حج کی صورت میں دیا گیا ہے۔ وہ اسی میں جئیں گے جس میں وہ لوگ جئے جن کی یادگار میں حج کی عبادت ادا کی جاتی ہے۔

حج کے مناسک کو قرآن میں شعائر کہا گیا ہے یعنی علامتی چیزیں۔ یہ سب در اصل حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزرنے والے واقعات ہیں جو مذکورہ منصوبہ الٰہی کی تکمیل کے دوران پیش

آئے۔ ان واقعات کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے اور اس طرح یہ عہد کرتا ہے کہ وہ بھی اسی تاریخ کا جز ربنے گا۔

حاجی گویا یہ عہد کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی دنیا کو اجاڑ کر حق کی طرف بڑھے گا۔ وہ آرام و راحت کو چھوڑ کر قناعت اور سادگی پر اپنے آپ کو راضی کرے گا۔ وہ خدا کے لئے دوڑے گا اور خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ شیطانی بہکاوؤں کو پتھر مار کر اپنے سے دور بھگائے گا۔ خدا کا دین اس کو جہاں لے جائے وہاں وہ جائے گا۔ اور جس چیز کا تقاضا کرے گا اس کو وہ اس کے حوالے کردے گا۔ وہ عمل کی زبان میں خدا سے کہتا ہے کہ اگر دوبارہ دین کے لئے ضرورت پیش آئی تو وہ اس آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہے کہ اپنی اولاد کو ذبح کر کے دین کی ضرورت پوری کرے۔

حضرت ابراہیم کا عراق سے چل کر مکہ آنا اور یہاں مذکورہ واقعات کا پیش آنا ایک عظیم خدائی منصوبہ تھا جو ڈھائی ہزار سال میں بروئے کار لایا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اب سے پانچ ہزار سال پہلے انسانی ذہنوں پر شرک کا اتنا غلبہ ہوگیا تھا کہ زندگی کا کوئی شعبہ شرک سے خالی نہ تھا۔ یہ صورت حال نسل در نسل جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی نسلوں میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اس زمانہ کی آبادیوں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ شرک کا ذہن لے کر پیدا ہوتا اور اسی پر اس کی پوری اٹھان ہوتی۔ اس بنا پر پیغمبروں کی توحید کی دعوت کسی طرح لوگوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔

اب خدا نے یہ منصوبہ بنایا کہ انسانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو مشرکانہ ماحول سے الگ ہوکر پرورش پائے تاکہ وہ مشرکانہ تسلسل سے آزاد ہوکر سوچ سکے۔ اس کے لئے شہری آبادیوں سے دور ایک غیر آباد مقام ہی مناسب ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے عرب کے خشک علاقہ کا انتخاب کیا گیا جو اس زمانہ میں آباد دنیا سے الگ تھلگ بالکل غیر آباد حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اب اس بے آب و گیاہ علاقہ میں ایک نئی نسل تیار کرنے کے لئے وہ پہلا انسان درکار تھا جو موت کی قیمت پر وہاں بسنے کے لئے تیار ہو۔ اس نازک موقع پر حضرت ابراہیم کو خواب دکھایا گیا کہ آپ اپنے نوجوان بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ جسمانی ذبح حقیقۃً صحرائی ذبح کی تمثیل تھی۔ اس کے ذریعہ یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کیا ابراہیم اس کے لئے تیار ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں اس طرح شامل کریں کہ اپنی محبوب اولاد کو لے جا کر حجاز میں بسا دیں جہاں خشک پہاڑوں اور ریتیلے صحراؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں حجاز میں بسنا موت کی وادی میں بسنے کے ہم معنی تھا۔

قدیم زمانہ میں حجاز اسی لئے غیر آباد پڑا رہا کہ وہاں پانی اور سبزہ نہ تھا۔ قدیم حجاز کا مشرکانہ تمدن

سے پاک رہنا اسی لئے ممکن ہوا کہ وہ زندگی کے سامان سے خالی تھا۔ قدیم حجاز کی وہ خصوصیت جس نے اس کو مشرک انسانوں سے خالی رکھا تھا، اسی نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہاں موحدین کی ایک نئی نسل تیار کی جائے۔ حضرت ابراہیم کا اپنے نوجوان بیٹے (اسماعیل) کے گلے پر چھری رکھنا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اس قربانی کے لئے آخری طور پر تیار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو اس منصوبہ خداوندی کے لئے چن لیا گیا اور ان کو قدیم حجاز کے الگ تھلگ علاقہ میں بسا کر نئی نسل تیار کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔

حضرت ابراہیم نے اسماعیل کی نسل میں ایک پیغمبر پیدا ہونے کی دعا کی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی دعا کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، دعا اور اس کی قبولیت کے درمیان ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ اس تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اس مدت کے دوران وہ نسل تیار کی جا رہی تھی جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہوکر سوچ سکے اور صحرائی تربیت کے نتیجہ میں جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیغمبر کا ساتھ دے کر اس شکل مشن کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ اسی لئے اس گروہ کو "خیر امت" کہا گیا۔ یہ امت تاریخ کی انوکھی امت ہے۔ ابتداءً ضرور اس کی ایک تعداد پیغمبر کی دشمن ہوگئی۔ مگر جب اس کی سمجھ میں آگیا تو اس نے بھرپور طور پر آپ کا ساتھ دیا۔

اس طرح جو نسل بنائی گئی اس کے اندر اگرچہ بعد کو اطراف کی دنیا سے کچھ شرک کے اثرات آگئے۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک محفوظ نسل تھی۔ کچھ ناقص افراد کو چھوڑ کر وہ لوگ صحیح فطرت پر قائم تھے۔ انھوں نے ابتداءً پیغمبر کی مخالفت بھی کی۔ مگر اس کا سبب زیادہ تر ناسمجھی تھا۔ جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ واقعی یہ پیغمبر ہیں اور ان کا دین برحق ہے تو ان کی مخالفت دوبارہ موافقت میں تبدیل ہوگئی۔ وہ بھرپور طور پر آپ کے ساتھی بن گئے۔

حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو "ذبح" کر کے جو نسل تیار کی اس کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ آزاد ذہن کے ساتھ حقیقت کو دیکھ سکتی تھی اور اس کا اعتراف کر سکتی تھی۔ حقیقت واقعہ کو مان لینے کی صلاحیت اس کے اندر کامل درجہ میں موجود تھی۔ یہاں اس سلسلہ میں تین مختلف مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک شخص وہ جس نے حق کو سنتے ہی اسے مان لیا۔ دوسرا وہ جس نے ابتداءً انکار کیا مگر جب بات سمجھ میں آگئی تو اس نے اعتراف میں دیر نہیں کی۔ تیسرا وہ جس نے اگرچہ اپنی سرداری کی خاطر اعتراف نہیں کیا مگر وہ بھی اس صفت عام سے خالی نہ تھا۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں ایمان لائے ان میں سے ایک خالد بن سعید بن العاص تھے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ: اے محمد، آپ کس چیز کی طرف بلاتے

ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور یہ کہ تم پتھروں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کس نے ان کی عبادت کی اور کس نے ان کی عبادت نہیں کی (ولا یدری من عبدہ ممن لا یعبدہ) خالد نے یہ سن کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت خالد کے والد جو مشرک تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو انھوں نے ان کو پکڑا اور انھیں مارنا شروع کیا یہاں تک کہ مارتے مارتے لکڑی ٹوٹ گئی۔ جب حضرت خالد اسلام سے پھرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو باپ نے کہا کہ میں تمہارا کھانا پینا بند کر دوں گا اور تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ حضرت خالد نے جواب دیا، خدا کی قسم محمد نے جو کہا سچ کہا اور میں ان کا پیرو ہوں (قد صدق واللہ واتبعتُہ) دوسرے لفظوں میں یہ کہ محمد جب ایک حق بات کہہ رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ میں اسے نہ مانوں۔

۲. دوسری مثال سہیل بن عمرو کی ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت وہ مخالفین اسلام کے نمائندہ تھے۔ طویل گفت و شنید کے بعد جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو املا کراتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

ھـذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ

سہیل بن عمرو نے ان الفاظ پر سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ آپ سے لڑائی کرتے (واللہ لو کنا نعلم انک رسول اللہ ما صددناک عن البیت ولا قاتلناک)

بعد کی تاریخ نے بتایا کہ سہیل بن عمرو ان الفاظ میں پوری طرح صادق تھے۔ وہ واقعۃً نہ سمجھنے کی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ بعد کو جب ان کی سمجھ میں آگیا کہ آپ سچے پیغمبر ہیں تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد اپنی پوری زندگی اسلام کی حمایت اور تائید میں وقف کر دی۔

۳. تیسری مثال ابوجہل کی ہے۔ ابوجہل نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر اس کے یہاں بھی اس عرب کردار کا ایسا نمونہ ملتا ہے جس کی مثال مشکل سے کہیں دوسری جگہ ملے گی۔

مکی دور کا واقعہ ہے کہ ایک روز ابوجہل کی ملاقات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ اس نے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہ واقعہ مکہ کی ایک عورت

دیکھ رہی تھی۔ اس نے آپ کے چچا حمزہ بن عبد المطلب سے کہا کہ آج ابوجہل نے آپ کے بھتیجے سے بہت نازیبا انداز میں کلام کیا ہے۔ اس وقت حمزہ کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ وہ اس کو لئے ہوئے ابوجہل کے پاس آئے اور کمان سے اس کے سر پر اس طرح مارا کہ اس کا سر بری طرح زخمی ہو گیا۔ ابوجہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے کچھ لوگ حمزہ کو مارنے کے لئے دوڑے۔ ابوجہل نے اپنے آدمیوں کو روک دیا اور کہا کہ حمزہ کو چھوڑ دو کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو آج بہت برا بھلا کہہ دیا تھا (دَعُوا اباعُمارة فانی واللّٰہ قد سببت ابن اخیہ سباً قبیحا)

ہرقل کے مشہور واقعہ میں آتا ہے کہ اس نے ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا نبوت کے اعلان سے پہلے تم لوگوں نے محمد کو کبھی جھوٹ بولتے ہوئے پایا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ یہ واقعہ نقل کرکے ابن کثیر لکھتے ہیں:

وکان ابوسفیان اذ ذاك رأس الكفرة وزعیم المشرکین ومع هذا اعترف بالحق۔
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحة ۱۴۱)

ابوسفیان اس وقت کافروں کے سردار اور مشرکوں کے لیڈر تھے، اس کے باوجود انھوں نے حق کا اعتراف کیا۔

یہ تھی وہ انسانی نسل جو حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو "ذبح" کرکے بنائی۔ اور پھر اس کے منتخب افراد کے ذریعہ وہ "خیر امت" بنی جس نے دل و جان سے توحید کو قبول کیا اور پھر بے مثال قربانی کے ذریعہ دور شرک کو ختم کرکے دور توحید کو برپا کیا۔

حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت محمد تک یہ ایک ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ تھا۔ اس کا مرکز عرب کا وہ علاقہ تھا جس کو حجاز کہا جاتا ہے اور جس میں مکہ واقع ہے۔ حج اسی تاریخ کا علامتی اعادہ ہے۔ حج کے ذریعہ مسلمان دوبارہ یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اس منصوبہ خداوندی میں اپنے آپ کو شامل کریں گے۔ وہ لبیک اللّٰھم لبیک (ہم حاضر ہیں خدایا ہم حاضر ہیں) کہتے ہوئے ابراہیم اور اسماعیل کی سرزمین میں جمع ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان لوگوں پر حقیقی طور پر گزرا تھا اس کو چند دن میں علامتی طور پر دہراتے ہیں۔ اس طرح وہ خدا سے کہتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو وہ دوبارہ اس تاریخ کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو یہاں اس سے پہلے دہرائی گئی۔

آج زمانہ گھوم کر دوبارہ وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھا۔ اس وقت سارے عالم پر شرک کا غلبہ تھا، آج سارے عالم پر الحاد کا غلبہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان اگر مشرکانہ طرز پر سوچتا تھا تو آج کا انسان ملحدانہ طرز پر سوچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا مسئلہ بھی وہی ہے جو قدیم زمانہ کا مسئلہ تھا۔ اس

فرق کے ساتھ کہ قدیم زمانہ میں مشرکانہ شاکلہ لوگوں کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ آج لوگوں کے اوپر الحادی شاکلہ چھایا ہوا ہے۔ اس شاکلہ (ذہنی سانچہ) کو توڑنا ہی آج اسلام کا اصل کام ہے۔ آج بھی اسلامی مہم اسی نہج پر طے ہوگی جس نہج پر قدیم زمانہ کی اسلامی مہم طے ہوئی تھی۔

اب دوبارہ کچھ لوگوں کو ذبح ہونا ہے۔ اب پھر کچھ لوگوں کو اپنی اولاد کو صحرا میں ڈالنا ہے تاکہ دین کی تاریخ دوبارہ زندہ ہو۔ ماضی میں دور شرک کو ختم کرنے کے لئے ایک نسل کی قربانی درکار تھی۔ آج دور الحاد کو ختم کرنے کے لئے دوبارہ ایک نسل کی قربانی درکار ہے ــــــ یہی حج کا سب سے بڑا سبق ہے۔ اسی کا حج آج حج مبرور ہے، جو حج کے بعد یہ عزم لے کر وہاں سے واپس آئے۔

یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو اسلامی مرکز دہلی کے ماہانہ اجتماع ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴ میں کی گئی۔

لعنت کیا ہے

یہود میں جب بگاڑ آیا تو پیغمبروں کے ذریعہ ان پر لعنت کی گئی ۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اُن پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے نکل جاتے تھے ۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے درمیان ہونے والی بُرائی سے روکتے نہ تھے ۔ کیسا بُرا کام تھا جو وہ کر رہے تھے ۔ تم اُن میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں ۔ کیسی بُری چیز ہے جس کو وہ اپنے آگے بھیج رہے ہیں جس سے اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے ۔ اور اگر وہ اللہ پر اور رسول پر اور جو کچھ اس پر اترا ہے اس پر ایمان لاتے تو وہ ان کو دوست نہ بناتے ، مگر ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (مائدہ ۸۱ - ۷۸)

لعنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبروں نے آ کر یہود کے سامنے یہ الفاظ دہرائے کہ "تم پر لعنت ہے" یا "تم ملعون ہو"۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان کے مذہبی بھرم کو کھولا ۔ یہود عملاً اپنی خواہشات اور اپنے قومی تعصبات پر چل رہے تھے مگر اپنی اس روش کو مذہب کا نام دیتے تھے ۔ انھوں نے خدائی تعلیمات کی خود ساختہ تشریح کر کے اس کو اپنے حسب حال بنا لیا تھا ۔ پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کے اس فریب کو بے نقاب کیا ۔ ان کا تجزیہ کر کے کھول دیا کہ وہ کیا ہیں اور اپنے کو کیا ظاہر کر رہے ہیں ۔

مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہود پر یہ لعنت حضرت داؤد اور حضرت مسیح کے ذریعہ کی گئی ۔ ان پیغمبروں کی تقریریں آج بھی بائبل میں موجود ہیں ۔ ان کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس "لعنت" کی عملی صورت کیا تھی ۔ یہاں ہم حضرت داؤد کے اقوال کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں :

خدا شریر سے کہتا ہے ۔ تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ ۔ اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے ۔ جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے ۔ اور تو میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ۔ تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا ۔ اور تو زانیوں کا شریک رہا ہے ۔ تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے ۔ اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے ۔ تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے ۔ اور اپنی ہی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے ۔ تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں ۔ لیکن میں تجھے ملامت کر کے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا ۔ اے خدا کو بھولنے والو اسے سوچ لو ۔ ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو ۔ جو شکر گزاری کی قربانی گزرانتا ہے وہ میری تمجید کرتا ہے ۔ اور جو اپنا چال چلن درست رکھتا ہے اس کو میں خدا کی نجات دکھاؤں گا (زبور ۵۰)

فکری توجیہہ

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں دو مفکرین نے امریکہ میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ تھے ہربرٹ اسپنسر (۱۹۰۳ - ۱۸۲۰) اور ولیم گراہم سمنر (۱۹۱۰ - ۱۸۴۰) اس مقبولیت کا راز ایک لفظ میں یہ تھا کہ وہ سوشل ڈارونسٹ (Social Darwinist) تھے۔ یعنی انھوں نے ڈارون کے بقاء اصلح (Survival of the fittest) کے نظریہ کو سماجی زندگی پر منطبق کیا۔

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) نے انواع حیات کے ارتقاء کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین پر ابتداءً زندگی کی مختلف قسمیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں بقاء کی جدوجہد شروع ہوتی ہے پھر جو نوع زیادہ صالح ثابت ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور جو انواع کمتر درجہ کی ہوتی ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح زندگی ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

یہ نظریہ جس کو ارتقاء کا نظریہ کہا جاتا ہے، خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ نظریہ نہ تھا۔ مگر انیسویں صدی کی دنیا میں مغربی قوموں کے لئے وہ بہت سودمند ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ دوسری قوموں پر ان کے معاشی اور تہذیبی غلبہ کے لئے فطری جواز فراہم کرتا تھا۔ اس نظریہ کے حوالے سے وہ کہہ سکتے تھے کہ دنیا کی قوموں کو ہماری برتری تسلیم کرنا چاہئے۔ کیوں کہ وہ ہم کو عین قانون قدرت کے تحت حاصل ہوئی ہے۔ وہ ہمارا فطری حق ہے نہ کہ ظلم یا استحصال کا کوئی واقعہ۔

اسپنسر (Herbert Spencer) اور سمنر (W.G. Sumner) کو مغربی قوموں، خصوصاً امریکہ میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کی قیمت تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس راہ میں استعمال کیا کہ وہ مغربی قوموں کو یہ مطلوب ذہنی غذا فراہم کریں۔ وہ اپنی فلسفیانہ صلاحیت اور اپنی معاشی قابلیت سے یہ ثابت کریں کہ جو کچھ ہے یہی از روئے حق ہونا چاہئے تھا۔

اس سلسلے میں اسپنسر کے خیالات کا خلاصہ اس کے ان الفاظ میں ملتا ہے:

> I am simply carrying out the views of Mr. Darwin in their applications to the human race . . . all (members of the race) being subject to the increasing difficulty of getting a living . . . there is an average advance under the pressure, since only those who do advance under it eventually survive, and . . . these must be the select of their generation.
>
> Herbert Spencer, The Study of Sociolog
> New York, D. Appleton and Co., 1891 p.

میں سادہ طور پر مسٹر ڈارون کے خیالات کو انسانی نسل پر چسپاں کر رہا ہوں۔ نسل کے تمام افراد اپنی معاش حاصل کرنے کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی مشکل سے دوچار ہوتے ہیں۔ دباؤ کے زیر اثر ایک اوسط ترقی ہوتی ہے۔ بالآخر صرف وہ لوگ زندہ رہتے ہیں جو اس کے تحت ترقی کریں، اور یہ لازماً ان کی نسلوں کا انتخاب ہوتا ہے۔

سمنر نے جس طرح اس کی تعبیر کی ہے اس کا ایک نمونہ یہ ہے:

> The millionaires are a product of natural selection ... It is because they are thus selected that wealth—both their own and that entrusted to them—aggregates under their hands .... They may fairly be regarded as the naturally selected agents of society for certain work. They get high wages and live in luxury, but the bargain is a good one for society.
>
> William Graham Sumner, quoted in Richard Hofstadter, Social Darwinism in American Thought 1860-1915, Philadelphia, University of Pennsylvania Press 1945, p. 44

کروڑ پتی لوگ انتخاب فطرت کی ایک پیداوار ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرح انھوں نے اس دولت کو چنا ہے۔ خود بھی اور سونپے جانے کے اعتبار سے بھی۔ وہ ان کے ہاتھوں میں بڑھتی ہے۔ وہ واضح طور پر سماج کے کارندے سمجھے جا سکتے ہیں جن کو فطری طور پر متعین کام کے لئے منتخب کیا گیا ہو۔ وہ زیادہ بڑی اجرت لیتے ہیں اور عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر یہ سودا سماج کے لئے مفید ہے۔

موجودہ زمانہ میں نظریہ ارتقاء کی مقبولیت (اور اسی طرح دوسرے بہت سے نظریات کی مقبولیت) کا راز یہ نہ تھا کہ یہ نظریات بذات خود حق تھے۔ بلکہ ان کی مقبولیت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کی قومی خواہشات سے مطابقت رکھتے تھے جن کے درمیان وہ پیش کئے گئے۔ یہ نظریات ان قوموں کی کارروائیوں کے لئے فکری جواز فراہم کرتے تھے۔

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو یہ کہہ کر لیتا ہے کہ وہ اس کو حق سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کو صرف اس لئے لیتا ہے کہ وہ اس کی خواہشات کے مطابق ہے نہ کہ علم و عقل کے مطابق۔

اسلام کیا ہے

موجودہ زمانہ میں جب یہ کہا گیا کہ " مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے" تو اس کے جواب میں پرجوش طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ " مذہب ایک مکمل اجتماعی نظام ہے" بظاہر دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ مگر دونوں کے درمیان ایک چیز مشترک ہے۔ دونوں ہی گروہ مذہب کا تصور ایک " ڈھانچہ" کی صورت میں کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلا گروہ اس کو انفرادی ڈھانچہ کے معنی میں لیتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اجتماعی ڈھانچہ کے معنی میں۔

مگر مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نہ انفرادی ڈھانچہ ہے اور نہ اجتماعی ڈھانچہ۔ وہ ایک ربانی طریقہ ہے۔ مذہب (اسلام) کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی معرفت حاصل کرے۔ وہ غیبی حقیقت کو اپنے لئے مشہود حقیقت بنائے۔ اس کے قلب و دماغ پر خدا اور آخرت کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ ہر وقت اسی کی بابت سوچے۔ اس کی زندگی کا ہر رویہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

اسلام کا اصل مقصد ربانی انسان کو وجود میں لانا ہے۔ ایک ایک فرد کو خدا کی محبت اور خوف میں ڈھالنا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان اپنے وجود کے اندر اس ربانی انسان کی تخلیق کرے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرے۔ جو سب سے زیادہ آخرت کے لئے فکرمند ہو۔ جو اپنے روزمرہ کے معاملات میں سب سے زیادہ خدا کی مرضی کا لحاظ کرے، جو نفس اور شیطان کو چھوڑ کر ایک خدا کے آگے جھک جائے۔

ایمان و اسلام کیا ہے۔ یہ دراصل ایک دریافت (Discovery) ہے۔ خدا کی دریافت۔ ایک بندہ جب ظاہری چیزوں سے گزر کر حقیقت کو دیکھ لیتا ہے، جب وہ مخلوقات سے اوپر اٹھ کر خالق کو پالیتا ہے تو اسی کا نام ایمان و اسلام ہے۔ یہ ایک ایسا دیکھنا ہے جس کو لوگوں نے نہیں دیکھا۔ یہ ایک ایسا پانا ہے جس کو لوگوں نے نہیں پایا۔ ایمان و اسلام ایک تجربہ ہے جو انسانی روح میں ایک بھونچال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت کی زد میں آنا ہے جو آدمی کے پورے وجود کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ یہ پیدا شدہ انسان کا دوبارہ پیدا ہونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مخاطب فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماع کے اندر وہ نفسیاتی واقعات ظہور ہی میں نہیں آتے جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ اجتماع کو اسلام کا مخاطب بنانا اسلام کو گھٹانا ہے نہ کہ اس کو مکمل کرنا۔

ایمان بڑھتا ہے

ومن یقترف حسنۃ نزد لہ فیھا حسناً — اور جو شخص نیکی کرے گا ہم اس کے لئے اس کی خوبی بڑھائیں گے۔ (الشوریٰ ۲۳)

نیکی کرنے والے کی خوبی میں اضافہ کرنے کا مطلب کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ نیکی کے ثواب میں سے یہ ہے کہ نیکی کے بعد نیکی کی توفیق حاصل ہو اور برائی کے بدلہ میں سے یہ ہے کہ برائی کے بعد آدمی کو اور برائی کا موقع دیا جائے (قال بعض السلف ان من ثواب الحسنۃ الحسنۃ بعدھا ومن جزاء السیئۃ السیئۃ بعدھا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث صفحہ ۱۱۴)

نیکی کرنا انسان جیسی مخلوق کے لئے ایک شعوری واقعہ ہے۔ آدمی جب ایک نیکی کرتا ہے تو وہ ایک برائی کو ارادی طور پر چھوڑتا ہے اور ایک نیکی کو ارادی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک حقیقی نیکی کرنے والا آدمی نیکی کر کے اپنے شعور اور ارادہ کو متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو جگاتا ہے اور اپنی روح کے اندر آمادگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نیکی آدمی کو ایک نیا انسان بنا دیتی ہے۔ ہر نیکی کے بعد آدمی مزید اور نیکی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نیکی موجودہ دنیا میں ایک عمل ہے اور اسی کے ساتھ مزید عمل کا محرک بھی۔

دنیا میں ایک جمادات ہیں اور دوسرے نباتات۔ پتھر ایک جامد چیز ہے۔ وہ بس ایک حال میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے برعکس درخت ایک نمو پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ قرآن میں مومن اور ایمان کی مثال درخت سے دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا معاملہ پتھر جیسا معاملہ نہیں ہے کہ بس ایک حالت پر پڑا رہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے۔ یہاں قرآن کے چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

- جب قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (الانفال ۲)
- خدا کے لئے قربانی کے مواقع کو دیکھ کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (آل عمران ۱۷۳)
- اہل ایمان کے تقویٰ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے (محمد ۱۷)
- ہدایت پانے والوں کی ہدایت برابر بڑھتی رہتی ہے (مریم ۷۶)
- ایمان والوں کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے (الاسراء ۱۰۹)

اہل ایمان کی معرفت بڑھتی رہتی ہے (طہٰ ۱۱۴)

جو لوگ واقعی ایمان کی دولت پالیں ان کا ایمان اسی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ نہ پائیں ان کے لئے ایمان بس ایک جامد چیز ہوتی ہے، وہ بڑھنے اور ترقی کرنے والی چیز نہیں ہوتی۔

قال البیہقی عن عطاء بن یسار ان عبد اللہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعالَ نومن بربنا ساعۃً۔ فغضب الرجل وقال اولسنا بمؤمنین قال بلیٰ ولکنا نذکر اللہ فنزداد ایماناً

عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ کچھ دیر کے لئے اپنے رب پر ایمان لائیں۔ ساتھی یہ سن کر غصہ میں آگیا اس نے کہا کہ کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ حضرت ابن رواحہ نے کہا کہ ہاں ہم مومن ہیں، مگر ہم اللہ کی یاد کرتے ہیں تو اس سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

مذکورہ آدمی کے نزدیک ایمان کا مطلب یہ تھا کہ توحید کا کلمہ (لا الٰہ الا اللہ) پڑھ لیا جائے۔ کلمہ کی ادائیگی کے بعد اس کے نزدیک بات پوری ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت عبد اللہ بن رواحہ خدا کو اس کے ان کمالات کے ساتھ پائے ہوئے تھے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ پہلے آدمی کے نزدیک اگر کلمہ پڑھ کر بات ختم ہوتی تھی تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے نزدیک اس کے بعد بات شروع ہوتی تھی۔ خدا کا تصور ان کے ذہن میں اس طرح آتا تھا کہ وہ لامحدود کمالات کا خزانہ ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ان کے نزدیک ایسی چیز تھی جو لامحدود طور پر جاری رہے۔ وہ خدا میں جینے والے تھے۔ اور جو شخص خدا میں جئے وہ برابر خدا کی یاد کرتا رہے گا، اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ اس کی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔

قال عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، لو طہرت قلوبکم ما شبعتم من کلام ربکم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر تمہارے دل پاک ہو جائیں تو اللہ کی بات سے تم کو سیری نہ ہو۔

کسی بات سے سیر ہونے یا نہ ہونے کا تعلق آدمی کے ظرف سے ہوتا ہے۔ چھوٹا گڑھا تھوڑے سے پانی سے بھر جاتا ہے۔ مگر سمندر کو پانی کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بھرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اگر آدمی کے اندر کا ظرف یا اس کی سمائی کم ہو تو وہ ذرا سی بات سے بھر جائے گا۔ اور اگر اس کی سمائی بہت زیادہ ہو تو اس کو کبھی سیری حاصل نہیں ہوگی۔

ایک عام آدمی توحید کا مطلب صرف یہ جانتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لیا جائے۔ "کلمہ توحید" کا تلفظ کرنے کے بعد اس کو ایسا لگتا ہے کہ بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس کے پاس کچھ اور نہیں رہتا جس کو وہ سوچے یا اپنی زبان سے کہے۔ مگر جو شخص "توحید" کی حقیقت کو پا جائے اس کے پاس توحید کے

موضوع پر کہنے کے لئے اتنی زیادہ بات ہوگی جو کبھی ختم نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں سائنس دانوں نے کائنات کو دریافت کیا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی دنیا کو دریافت کیا ہے جس کے ایک ایک ذرہ کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں جو کبھی بیان نہ کی جاسکیں۔ پھر جو شخص کائنات کے خالق کو دریافت کرے اس کے پاس تو علم کا ایسا بھنڈار ہونا چاہئے جو سارے انسانی الفاظ بولنے کے بعد بھی ختم نہ ہو۔ جو دنیا کے تمام قلم اور دنیا کی تمام سیاہی کو استعمال کرنے کے بعد بھی لکھنے سے رہ جائے۔

اگر آپ نے خدا کو دریافت نہیں کیا ہے تو آپ کے پاس خدا کے نام سے بس چند الفاظ ہوں گے۔ لاالٰہ الاالله کا فقرہ زبان سے ادا کرنے کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد آپ اگر مزید کچھ جانیں گے تو وہ بس اسی فقرہ کی بے سوچی سمجھی تکرار ہوگی۔ لیکن اگر آپ واقعۃً خدا کو پالیں تو خدا کے بارہ میں آپ کے پاس اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو لکھنے اور بولنے سے کبھی ختم نہ ہوں۔ جن کے بارہ آپ کبھی سیر نہ ہوسکیں۔

خدا کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے خدا کی معرفت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوسکتی۔ جس طرح خدا لامحدود ہے اسی طرح خدا کی معرفت بھی لامحدود ہے۔ جس آدمی کی معرفت خداوندی لامحدود نہ ہو، اس نے ابھی حقیقی خدا کو نہیں پایا ہے۔ وہ کسی "محدود" میں اٹکا ہوا ہے، وہ ابھی "لامحدود" تک نہیں پہنچا۔

زور والے بے زور ہوں گے

دیاسلائی بنانے والے نے جب دیاسلائی بنائی تو اس نے جاننا چاہا کہ اس کی دیاسلائی کس حد تک جلانے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس نے کچھ لکڑی جمع کی اور اس کو جلاکر اس کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب جانوروں پر طرح طرح کے تجربے کئے جانے لگے۔ جانوروں کو زہریلی چیزیں کھلانا، جانوروں کے جسم کے کسی حصہ کو بیکار کرنا، جانوروں کو مار کر ان کا جائزہ لینا، وغیرہ۔ اب تجربات کا یہ سلسلہ اپنے تیسرے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ انسانوں پر تجربہ ہے۔ دنیا کی کچھ قومیں جنھوں نے "بڑی طاقت" کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ہلاکت خیز ہتھیار بناتی ہیں اور ان کی ہلاکت خیزی کا تجربہ کرنے کے لئے ان کو کمزور قوموں پر استعمال کرتی ہیں۔ نیٹو (NATO) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسپین کی سول وار میں ہٹلر نے اپنے ٹینک اور بمبار ہوائی جہازوں کو بے تکلف استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگ ہلاک یا معذور ہوگئے۔ تاہم ہٹلر نے فتح کی خوشی منائی۔ کیوں کہ اس کا مقصد اپنے ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کو جاننا تھا اور وہ حاصل ہوگیا۔ اسی طرح ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ نے اپنے ہیلی کوپٹر اتنی زیادہ تعداد میں اڑائے کہ زمین پر ان کے سایہ سے اندھیرا چھا گیا۔ یہ تاریخ کی پہلی جنگ تھی جس میں جنگی ہیلی کوپٹر استعمال کئے گئے۔ ویٹ نام کا چھوٹا سا ملک تباہ ہوگیا۔ تاہم امریکہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ وہ اپنے ہیلی کوپٹروں کی جنگی قوت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور ویٹ نام کو قبرستان بنا کر اس نے یہ اندازہ کرلیا۔ اب روس یہی کام افغانستان میں کر رہا ہے۔

روس نے بھاری قسم کے جنگی ہیلی کوپٹر بنائے ہیں۔ وہ ان کی مار کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کو کمزور افغانستان کی سرزمین حاصل ہوگئی ہے۔ اس نے افغانستان کو اپنے جدید ترین جنگی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ بنا دیا ہے۔ لاکھوں لوگ قتل اور برباد ہو رہے ہیں۔ بے شمار لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر پڑوسی ملک میں پناہ لے رہے ہیں۔ تاہم روس کا مقصد حاصل ہے۔ افغانوں کی زمین کو قبرستان بنا کر وہ اپنے جنگی ہتھیاروں کا تجربہ کر رہا ہے (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۰)

یہ دنیا کیا اندھیر نگری ہے۔ کیا خدا نے یہاں کچھ لوگوں کو طاقت ور بنا کر بھیج دیا کہ وہ اپنے طاقت ور ہونے کا انعام پائیں۔ اور کچھ لوگوں کو کمزور بنا کر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے کمزور ہونے کی سزا

بھگتیں۔ اس قسم کا خیال کرنا خدا کی خدائی کو باطل کرنے کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنایا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو منکر ہیں۔ ایسے منکرین کے لئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ان کو جو زمین میں فساد کرتے ہیں یکساں کر دیں گے۔ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں گے (ص)

جو لوگ اپنے ان ظالمانہ مشغلوں میں لطف رہے ہیں ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس دنیا کے مالک وہ نہ تھے بلکہ اس دنیا کا مالک خدا تھا۔ موت کا فرشتہ جب ان کو پچھاڑے گا تو وہ دیکھیں گے کہ وہ چیونٹی سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ وہ چیزیں جن کے بل پر وہ اپنے کو طاقت ور سمجھے ہوئے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آئیں گے وہ اوندھے منہ اپنے کو آخرت کی خندق میں گرا ہوا پائیں گے وہ پکاریں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی پکار کو سنے، وہ مدد چاہیں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی مدد کے لئے دوڑے۔

ایجنسی : ایک پروگرام

الرسالہ اس لئے نہیں ہے کہ آپ اس کو پڑھ کر اس کی تعریف کر دیں۔ الرسالہ آپ کی ذمہ داری کا عنوان ہے۔ الرسالہ آپ سے کچھ کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ کرنا یہ ہے کہ آپ اس کی ایجنسی لیں۔

اردو الرسالہ اردو داں طبقہ کے لئے ہے اور انگریزی الرسالہ انگریزی داں طبقہ کے لئے۔ مگر الرسالہ اپنے امکانی قارئین تک آپ ہی کے ذریعہ پہنچے گا۔ اگر آپ الرسالہ کی ایجنسی لئے ہوئے ہیں تو اس کو بڑھائیے۔ اور اگر آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی ہے تو فوراً ہم کو ایک خط لکھ کر ایجنسی شروع کر دیجئے۔

ادارہ الرسالہ

ایک سفر

ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے سلسلہ میں مراکو کا سفر ہوا۔ جولائی ۱۹۸۴ میں ملیشیا جانا ہوا تھا۔ اب نومبر ۱۹۸۴ میں مراکو جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ گویا اس مسلم دنیا کا ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف سفر تھا۔ جو ملیشیا اور انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک پھیلی ہوئی ہے۔

مراکو مغرب کی سمت میں افریقہ کا آخری ملک ہے جو اسپین کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ اس ملک کا دوسرا نام مغرب ہے۔ مراکو کا رقبہ دو لاکھ ۷۵ ہزار مربع میل ہے۔ اور آبادی ۲۰ ملین سے کچھ زیادہ ہے جس میں بیشتر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اس کی راجدھانی رباط ہے اور شاہ حسن ثانی اس کے موجودہ حکمراں ہیں۔

مراکو کو بنو امیہ کے دور میں عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقبہ بن نافع نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔ جب وہ خشکی کو فتح کرتے ہوئے مراکو کی آخری سرحد پر پہنچے جس کے آگے اٹلانٹک سمندر موجیں مار رہا تھا تو انھوں نے اسلامی جوش کے تحت اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور پانی کے اندر کھڑے ہو کر کہا :

واللہ لو علمت ان وراء ھذا البحر بلدا لخضتہ حتی لا یعبد احد دونک	خدا کی قسم اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر کو عبور کر کے وہاں پہنچتا یہاں تک کہ ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

دور اول کے مسلمان جس مقصد کے لئے سرشار ہو کر اٹھے تھے وہ لوگوں کو خدائے واحد کا عبادت گزار بنانا تھا۔ نہ کہ ملکی فتوحات حاصل کرنا۔ مگر بعد کی نسلیں اس راز کو بھول گئیں۔ انھوں نے فتوحات اور سیاسی کارناموں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔

۲۵ نومبر کو جب میں نے یہاں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں کھڑے ہو کر اٹلانٹک کی لہروں کو موجیں مارتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ موجیں آج بھی عقبہ بن نافع کے اس تاریخی قول کی امانت لئے ہوئے ہیں اور اس کو توحید کا نام لینے والوں تک پہنچا دینا چاہتی ہیں۔

مراکو کی فتح کے بعد طارق بن زیاد کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا۔ یہ وہی طارق بن زیاد ہے جس کے نام سے جبل الطارق (جبرالٹر) موسوم ہے۔ اس نے آبنائے جبرالٹر کے مقام پر سمندر کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہو کر اس کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا۔ اس کے بعد اسپین کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہو گئی۔ مگر بعد کو جب

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں مسیحی دوبارہ اسپین میں غالب آگئے تو انھوں نے چاہا کہ اسپین سے اسلامی تاریخ کو بالکل مٹا دیں۔ انھوں نے زبردست مظالم کئے چنانچہ مجبور ہو کر یہاں کے مسلمان یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے یا دوبارہ مسیحی بن گئے۔

مراکو میں فرانسیسی ۱۹۰۱ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ تک مراکو پر باقاعدہ قبضہ کرلیا۔ اسی دوران اسپینی بھی مراکو کے اس حصہ میں داخل ہوگئے جو ان کے قریب سمندر کی دوسری طرف تھا۔ تاہم ۱۹۵۶ میں فرانس اور اسپین دونوں سلطان کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہوگئے۔ اب مراکو مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہے۔

راقم الحروف نے مراکش (مراکو) کا نام سب سے پہلے بچپن میں شبلی نعمانی کی نظموں کے ذریعہ سنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں مراکش پر مغربی قوموں کا قبضہ ہوگیا تو شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا:

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے   کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مراکش (مراکو) اور فارس (ایران) اگرچہ آج مغربی اقوام کے سیاسی قبضہ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تہذیب کے قبضہ سے نکلنے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے۔

مراکش (بتشدید الراء) یہاں کا ایک قدیم شہر ہے۔ یورپی لوگ اکثر اسی نام کی نسبت سے یہاں کی حکومت کو حکومت مراکش کہتے تھے۔ اس طرح مراکش پورے ملک کے لئے بھی بولا جانے لگا۔ یہی لفظ بعد کو خود یوریپینوں کے اثر سے بگڑ کر مراکو (Morocco) بن گیا۔ مراکو دراصل مراکش کی بدلی ہوئی مغربی شکل ہے۔ مراکو ہی وہ ملک ہے جہاں سے گزر کر مسلمان یورپ میں داخل ہوئے تھے۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۴ کو صبح سویرے ایر انڈیا (۱۳۱) کے ذریعہ دہلی سے روم کے لئے روانگی ہوئی۔ ہوائی جہاز کی ایجاد نے موجودہ زمانہ میں دور دراز مقامات کے سفر کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ مگر خود ہوائی کمپنی کے لئے یہ صنعت براہ راست نفع بخش نہیں۔ بالواسطہ نفع کی بنیاد پر آج تقریباً تمام ملکوں نے اپنی ہوائی کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ مگر اکثر ہوائی کمپنیاں خسارہ پر چل رہی ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہوائی مسافروں کی کمی ہے۔ چنانچہ اکثر جہاز اپنی وسعت سے کم مسافر لے کر چلتے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ ہوائی جہاز ہیں جو خلیج کے مسافروں کو لے کر چلتے ہیں۔ کیوں کہ اس علاقہ میں پچھلے برسوں میں سفر بہت بڑھ گیا ہے۔

جہاز کے اندر مختلف اخبار و رسائل پڑھنے کو ملے۔ ٹائم میگزین (۱۹ نومبر ۱۹۸۴) کو الکشن اسپیشل کے طور پر چھاپا گیا ہے۔ اس میں بہت سی دل چسپ باتیں تھیں صفحہ ۴۹ پر امریکی لیڈر مانڈیل (Mondale) کا ایک قول درج تھا:

We're dealing with real problems, and we want real answers. This is not Hollywood.

ہم حقیقی مسائل سے نمٹ رہے ہیں اور ہم حقیقی جوابات چاہتے ہیں۔ یہ ہالی وڈ نہیں ہے۔

ہالی وڈ امریکہ کی فلمی دنیا کا نام ہے۔ فلم کی دنیا میں طرح طرح کے کردار ادا کئے جاتے ہیں مگر وہ سب کے سب غیر حقیقی ہوتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ ہر قسم کی طاقت رکھنے کے باوجود یہ جانتے ہیں کہ فلمی دنیا والی کارکردگی دکھلانے سے حقیقی دنیا میں نتائج نہیں نکل سکتے۔ مگر اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اس کے باوجود وہ فلمی دنیا جیسے ڈرامے دکھا کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی میں کامیابی کا ہمالیہ پہاڑ بنالیں گے۔

ان دنوں روس کے بچوں کے تھیٹر کے ڈائرکٹر پچنیکوف (Gennady M. Pechnikov) ہندستان آئے ہوئے تھے۔ پٹریاٹ (۲۴ نومبر ۱۹۸۴) میں ان کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے رامائن اور مہابھارت پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ بھی تھا:

Ramayana is much more than a religious book. It reflects man's eternal quest for truth.

رامائن کی حیثیت مذہبی کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ خارجی دنیا میں انسان کی تلاش حق کی عکاسی کرتی ہے۔

پچنیکوف نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ اپنے اشتراکی ذہن کی وجہ سے مذہب کو صرف ایک مفروضہ روایت سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مذہب کی حقیقت کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ مذہب اور سچائی دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ انسان کی تلاش حق کے صحیح جواب ہی کا دوسرا نام مذہب ہے۔

دہلی سے ٹھیک ساڑھے چھ بجے صبح کو روانگی ہوئی۔ نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز روم میں اترا۔ دہلی سے روم کا فاصلہ سات ہزار کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔

میں اگلے جہاز کے انتظار میں روم کے بین اقوامی ہوائی اڈہ پر تھا۔ میرے سامنے ہوائی اڈہ کا وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جہاز روانہ ہو رہے تھے۔ ابتداءً وہ کھڑے ہوئے نظر آتے پھر وہ متحرک ہو کر تیز دوڑنے لگتے۔ پھر وہ فضا میں بلند ہو کر اڑنے لگتے۔ بظاہر جہاز ایک بے جان مادہ کا مجموعہ ہے مگر یہی بے جان مادہ متحرک ہو کر تیزی سے چلنے لگتا ہے۔

"یہ واقعہ بھی موسیٰ کے عصا سے کم عجیب نہیں،" میں نے سوچا " وہ اندھے لوگ تھے جن کو عصا کا معجزہ دکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ یہاں کائنات کی ہر چیز معجزہ ہے۔ حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا متحرک

ہوکر زمین پر چلنے لگنا جتنا عجیب ہے اتنا ہی عجیب یہ بھی ہے کہ بے حرکت مادہ ایسی سواریوں میں تبدیل ہو جائے جو دوڑتی ہیں، جو اڑتی ہیں۔ جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو بھی وہی خدا چلا رہا ہے جس نے موسیٰ کے عصا کو چلایا تھا۔

اس حقیقت کی طرف خود قرآن میں اشارہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ کے عصا کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ: فاذا ھی حیۃ تسعیٰ اور عام چیزوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ یخرج الحی من المیت ان دونوں آیتوں کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ مگر دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بتا رہی ہیں۔ روزمرہ کے مشاہدہ میں مادہ کا زندہ چیز بن کر چلنے لگنا بھی اسی خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے جس کے حکم سے ایک لاٹھی سانپ بن کر چلنے لگی تھی۔

روم میں چند گھنٹے قیام کے بعد ایر مراک (۹۵۵) کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ شام کو میں کیسا بلانکا پہنچا۔ یہ مراکو کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا کچھ حصہ پرانے وضع کا ہے اور کچھ حصہ جدید وضع پر بنایا گیا ہے۔ یہ اس ملک کا تجارتی مرکز ہے۔ بیرونی ملکوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے ہیں، تجارت کے لئے بھی اور سیاحت کے لئے بھی۔

کیسا بلانکا اٹلانٹک کے عین ساحل پر واقع ہے۔ اس کا قدیم عربی نام الدار البیضاء ہے۔ مغربی استعمار کے زمانہ میں وہ کیسا بلانکا (Casablanca) کے نام سے مشہور ہوا۔ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی سفید گھر۔ الدار البیضاء عربی لفظ ہے اور کیسا بلانکا اسی کا اسپینی مترادف ہے۔

کیسا بلانکا میں میرا قیام ہوٹل سفیر (روم ۱۲۰۷) میں تھا۔ یہ ہوٹل اٹلانٹک کے ساحل کے قریب ہے۔ یہاں سے اٹلانٹک کی موجیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس پر نظر پڑی تو یہ سوچ کر میری عجیب کیفیت ہوئی کہ یہی وہ سمندر ہے جس کے دوسری طرف کھڑے ہو کر طارق بن زیاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: البحر وراءکم والعدو امامکم (سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے) پھر یہیں سے گزر کر طارق بن زیاد اسپین میں داخل ہوا اور یورپ میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے یہ پیش قدمی زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکی۔ تاہم یہ تاریخ مسلمانوں کو بہت بڑا سبق دے رہی ہے۔ یہ کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور یہ بھی کہ انھیں کیا نہیں کرنا چاہئے تاکہ ان کی قوتیں اسباب کی اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر نہ رہ جائیں۔

۲۵ نومبر کو میں ہوٹل کے باہر کی سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ پولس کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے عربی میں بات شروع کی۔ مجھے اس کے لہجہ کو سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ میں نے اس سے اپنا کلام دہرانے کے

لئے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا کہ یہ تو ہم فصیح عربی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم مراکو کے لہجہ میں عربی بولیں تو وہ آپ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد وہ مراکو کے لہجہ میں بولنے لگا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ عربی کے علاوہ کوئی اور زبان بول رہا ہے۔

حضرت علی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف عرب قبائل سے ان کی اپنی بولی میں گفتگو کرتے تھے اور ہم اس کو بالکل سمجھ نہیں پاتے تھے۔ یہ صورت حال اسی لہجہ کے فرق سے پیدا ہوتی تھی۔ لہجہ کا فرق سننے والے کے لئے ایک زبان کو ایسی زبان بنا دیتا ہے جیسے وہ کوئی دوسری زبان ہو۔

ہندستان میں میں پچھم کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا تھا۔ مراکو میں اس کے برعکس پورب کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو قبلہ کے دوسری سمت میں واقع ہے۔ اس سفر نے مجھے زمین کے ایک طرف سے اٹھا کر اس کی دوسری طرف پہنچا دیا تھا۔ مراکو میں اس طرح نماز پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہوا کہ مسلمان "پورب" اور "پچھم" کا پابند نہیں، وہ صرف "قبلہ" کا پابند ہے۔ دنیا اس رخ پر جا رہی ہو یا اس رخ پر، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم خدا کے رخ پر قائم رہیں، ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کبھی نہ ہٹیں۔

کیسا بلانکا میں شہر کے اندرونی حصوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو یہاں کا باشندہ ہے۔ مگر وہ صرف فرانسیسی میں بول سکتا تھا۔ عربی زبان بولنے پر قادر نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کچھ ایسے خاندان بھی ہیں، جو فرانسیسی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ یہ فرانس کے دور اقتدار کی نشانی ہے۔ یہاں ٹیلی وژن سے لے کر زبان اور فرنیچر ہر چیز پر فرانسیسی تہذیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام پس منظر میں جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ وہ ایک تاریخی روایت بن گیا ہو۔

کیسا بلانکا کی مختلف سڑکوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ مگر سڑک پر کوئی مسجد یا مینار دکھائی نہیں دیا۔ اذان کی آواز بھی کسی وقت سننے میں نہیں آئی۔ سڑکوں پر ہوٹل اور بینک اور دفاتر کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے درمیان کہیں مسجد ابھری ہوئی نظر نہ آئی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ مسجدیں سڑکوں کے پیچھے پائی جاتی ہیں۔ تاہم وہ زیادہ شاندار نہیں ہیں۔

ہندستان سے نکل کر ہم بہت سے ملکوں سے گزرتے ہوئے مراکو پہنچے۔ مثلاً خلیج عرب کے ممالک، شام ترکی، یونان، اٹلی وغیرہ۔ ان ملکوں میں سے کسی کا بھی میرے پاس ویزا نہیں تھا۔ جب کہ مراکو میں داخلہ کے لئے مجھے نئی دہلی کے سفارت خانہ سے باقاعدہ ویزا لینا پڑا۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو میں میں زمینی مسافر تھا اور یہاں مجھ کو قیام کرنا تھا۔

جب کہ دوسرے ملکوں کا میں نے صرف ہوائی سفر کیا اور ان کی زمین پر نہیں اترا ـــــ اگر آپ کسی شخص یا قوم کے اوپرا وپر گزر جائیں تو وہ آپ سے تعرض نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ اس کی حقیقی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو وہ تعرض کرے گا اور آپ کے خلاف رکاوٹیں ڈالے گا۔

قوموں کا یہ مزاج زندگی میں کامیابی کا نہایت گہرا اصول دیتا ہے۔ یہ کہ آدمی لوگوں کو چھیڑے بغیر اپنا کام کرے۔ وہ اپنا منصوبہ اس طرح پورا کرے کہ وہ لوگوں کو بالکل بے ضرر معلوم ہو۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں فرمایا تھا "تم سانپ کی مانند ہوشیار اور کبوتر کی مانند بے آزار بنو۔"

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کے برعکس ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے لیڈر ضرر رسانی سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ دین کے نام پر قتل، دین کے نام پر نفرت، دین کے نام پر جھگڑوں اور ہنگاموں نے اکثر ملکوں میں دینی کام کرنے کو انتہائی دشوار بنا دیا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب جو کیسابلانکا کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں مسلمان چوں کہ عام طور پر پرامن ہیں اور وہ بڑی حد تک سیاست سے الگ رہتے ہیں، اس لئے وہاں تبلیغ اسلام کے کام پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں اگرچہ عیسائی حکومت ہے مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتی۔ چاہے سارے لوگ اسلام سے نکل جائیں یا سارے لوگ اسلام میں داخل ہوجائیں (الحکومۃ لاتہتم بذالک فلیخرجوا کلھم او یدخلوا کلھم) یہی صورت حال تقریباً پورے افریقہ میں ہے۔

اس صورت حال نے افریقہ کے عظیم براعظم میں اس کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ یہاں بغیر روک ٹوک اسلام کی اشاعت کی جاسکے۔ اگرچہ عملاً ابھی اس امکان کو بہت کم استعمال کیا جاسکا ہے ـــــ کچھ ملکوں میں مسلمان اپنے خلاف جھوٹی رکاوٹیں کھڑی کرکے دینی کام کی راہ میں مشکلات پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور کچھ ملکوں میں اپنی غفلت کی وجہ سے مواقع کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔ نتیجہ دونوں جگہ یکساں ہے۔ اگرچہ ایک مقام پر ایک سبب سے اور دوسرے مقام پر دوسرے سبب سے۔

میرے پاس کانفرنس کی طرف سے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں ۲۴ نومبر کا پیشگی رزرویشن تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ۲۵ نومبر سے کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ رزرویشن کے مطابق ۲۴ نومبر کو دہلی سے روانہ ہوکر اسی دن شام کو کیسابلانکا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اصل کارروائی ۲۸ نومبر سے شروع ہوگی۔ اس طرح مجھے تین دن (۲۵ - ۲۶ - ۲۷ نومبر) غیر ضروری طور پر کیسابلانکا میں گزارنے پڑے۔ یہ تین دن اگرچہ مجھے "فائیو اسٹار ہوٹل" میں گزارنا تھا۔ مگر یہ تین دن اتنی مشکل سے گزرے کہ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ تین صدیاں گزر گئیں۔ میں نے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے بالوں کی سفیدی میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے کوئی برتر مقصد نہ ہو ان کے لئے اس طرح کے ایام تفریح کے ایام ہوتے ہیں۔ مگر ایک بامقصد انسان کے لئے تین دن یقیناً تین صدیوں سے کم نہیں۔

وہ چیز جس کو فائیو اسٹار ہوٹل کہتے ہیں حقیقۃً ایئر کنڈیشنڈ جیل خانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایسے ہوٹلوں میں آدمی کو ایک ایسے ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں ہر چیز مصنوعی ہوتی ہے۔ دھوپ کی جگہ بجلی، ہوا کی جگہ ایر کنڈیشنر، گھاس کے فرش کی جگہ قالین، سبزہ کی جگہ پلاسٹک کے پھول اور پودے۔ چڑیوں کے نغمے کی جگہ انسانی موسیقی، نیلے آسمان کی جگہ منقش چھت، غرض ہر چیز مصنوعی طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ آدمی بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے سے قدرت کے مناظر دیکھتا ہے مگر وہ ان سے براہ راست مربوط نہیں ہو سکتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ قدرت کے مشینی بدل کے اندر محبوس ہو کر اپنے صبح و شام گزارتا رہے۔

ہوٹل سفیر میں میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اس کے اندر کوئی کھلی ہوئی جگہ ہے جہاں قدرتی ہوا اور دھوپ مل سکے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ انھوں نے ہر قدرتی چیز کو بند کر رکھا ہے (ھم قفلوا کل شئ) تلاش وجستجو کے بعد بالآخر میں نے ایک جگہ ڈھونڈ نکالی اور وہاں جا کر دھوپ اور کھلی ہوا میں بیٹھنے لگا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے انھوں نے کہا آپ کو اس قسم کا ماحول بہت پسند ہے۔ میں نے کہا، اس میں مجھے ایک قسم کا ربانی لمس محسوس ہوتا ہے۔

اس کانفرنس میں مختلف ملکوں اور براعظموں کے لوگ شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے افریقہ کے ایک صاحب سے افریقہ کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے بارہ میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم ان میں آئی ہے مگر ابھی اس معاملہ میں وہ اپنے پڑوسی عیسائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ماضی میں ہمارے لوگوں کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو ایمان سے دور کر دیتی ہے (التعلیم شئ یُبعد الرجل من الایمان)۔ یہی حال ہندستان میں بھی مسلمانوں کا ہوا ہے۔

جن بزرگوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا وہ اگرچہ نیک نیت تھے۔ مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کمیونزم کی تعلیم سے روکتے تو یہ صحیح ہوتا کیونکہ کمیونزم ذہن کے فساد کا دوسرا نام ہے۔ مگر انھوں نے سائنس کی تعلیم سے بھی مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ سائنس موجودہ زمانہ میں قوت کے ہم معنی تھی۔ سائنس کی تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مسلمان دور جدید میں کم از کم سو سال پیچھے ہو گئے۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قدرتی ذخائر کی کثرت ہے۔ مگر دوسری قومیں ان کا

استغلال کر رہی ہیں اور اپنی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

کیسا بلانکا میں شراب اور نائٹ کلب تک کی آزادی ہے۔" پورک " کی دکان بھی نظر آئی۔ اس لئے یہاں مغربی سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ یہ سیاحوں کا شہر بن گیا ہے۔ ایک عرب اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ آئے اور ہوٹل سفیر میں مقیم ہوئے۔ وہ غالباً سیاحت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ میں نے دیکھا تو ان کے بیوی بچے فیشن کے سامان اور جدید طرز کے کھلونوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ان عرب صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف بے تکان بولنے لگے۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو خود تو عملاً اپنے پورے خاندان کے ساتھ مادی تہذیب میں غرق ہیں اور زبان سے اس کے خلاف تقریر کرنے میں مشغول ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں اکثر پڑھے لکھے مسلمانوں کا حال ہو گیا ہے۔ وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف خوب لکھتے اور بولتے ہیں مگر ان کے گھر کو اور ان کے بیوی بچوں کو دیکھئے تو سراپا مادی تہذیب میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔ حتی کہ ایک مسلمان جو میرے ساتھ ہوائی جہاز میں میرے بغل کی سیٹ پر تھے، انھوں نے ہوائی جہاز کی ضیافت کو قبول کرتے ہوئے شراب لی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی ہوٹل سفیر میں آکر ٹھہرے۔ ایک ملاقات کے دوران ان سے گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ " آجکل مسلمانوں کے معاملات بالکل غیر اسلامی ہو گئے ہیں " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے اسلام بھی مختلف فیشنوں میں سے ایک فیشن بن گیا ہے۔

ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود جو چاہے کرے۔ اس کو اپنے آپ پر اسلام کو نافذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی اسلامیت کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دوسروں کی غیر اسلامی روش پر لکھنے اور بولنے کی لامتناہی صلاحیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر لکھنے اور بولنے والے بے شمار تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں مگر لوگوں کا یہی وہ تضاد ہے جس نے ان کی تمام کوششوں کو بالکل بے نتیجہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

کیسا بلانکا میں چڑیاں کافی نظر آئیں۔ مگر یہ سب سمندری چڑیاں تھیں۔ جانور ہمیشہ اپنے ماحول کی مناسبت سے جمع ہوتے ہیں۔ سمندری ماحول میں سمندری چڑیاں، صحرائی ماحول میں صحرائی چڑیاں اور سر سبز پہاڑوں کے ماحول میں پہاڑی چڑیاں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ وہ بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی تحریک کے ساتھ سیاست کی چاشنی لگا دیں تو سیاسی ذوق کے لوگ جوق در جوق آپ کے پاس اکٹھا ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی تحریک کے ساتھ تصوف کی غذا موجود ہو تو برکت تلاش کرنے والوں کی بھیڑ آپ کے گرد نظر آنے لگے گی۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کینیا سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ ان کی

عمر ابھی ۳۷ سال ہے۔ مگر کم عمر ہونے کے باوجود انھوں نے وہ کام کیا ہے جو بڑوں کے کام سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Shariff Salim Shariff Hussein
P.O. Box 128, Marsabit, Kenya. E. Africa

آجکل کی زبان میں وہ کوئی معروف و مشہور آدمی نہیں مگر انھوں نے بہت قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جناب شریف سالم شریف حسین نے بتایا کہ وہ پہلے راجدھانی نیروبی میں رہتے تھے۔ وہاں ان کے لئے ذاتی اعتبار سے بہت مواقع تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ شہروں سے کام کرنا مکان کو گویا چھت کی طرف سے تعمیر کرنا ہے۔ وہ نیروبی چھوڑ کر ایک ہزار کلو میٹر دور ایک گاؤں مرسابت چلے گئے۔ وہاں اس وقت ان کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے بنیاد کھود کر ایک مدرسہ اور مسجد بنایا۔ انھوں نے کچھ ساتھیوں کو جوڑ کر یہ کوشش کی کہ لوگوں کے ذہن کو جگائیں۔ انھوں غریب بچوں کے کپڑے فراہم کئے۔ انھوں نے ضرورت مند کسانوں کو مویشی خرید کر دئے۔ اس علاقہ کے لوگ بہت غریب ہیں۔ مگر انھوں نے لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کیا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں تمہاری سب سے بڑی دولت ہیں مثلاً وہ ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں وعظ کیا۔ گاؤں والوں نے کہا ہمارے یہاں نہ مسجد ہے اور نہ مدرسہ۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ تمہارے پاس پانی ہے۔ مٹی ہے پتھر ہے لکڑیاں ہیں۔ اور خدا کے دئے ہوئے ہاتھ ہیں ان کو استعمال کرو۔ چنانچہ ان کی تحریک سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹ تیار کی اور لکڑیاں جمع کیں اور تھوڑی سی سیمنٹ خرید کر خود اپنی محنت سے ایک مسجد اور مدرسہ کھڑا کر دیا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ مسجد اور مدرسہ اگر کسی بیرونی ملک کے ڈالر سے بنا ہوتا تو کسی کو اس سے دل چسپی نہ ہوتی۔ مگر آج گاؤں والوں کو اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے کیونکہ اس اینٹ کو انھوں نے خود اپنا پسینہ بہا کر بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پورا علاقہ اس سے پہلے پس ماندہ حالت میں پڑا ہوا تھا مگر آج اس کو ہمارے گاؤں نے جگا دیا ہے (ولٰکن قریتنا ھذا الاٰن ایقظتھم)

وہ تعلیم، تعمیر، دعوت اور اصلاح ہر میدان میں کام کر رہے ہیں انھوں نے اس کی جو تفصیل بتائی اس کو لکھنے کے لئے ایک پورا مضمون چاہئے تاہم اس کو سن کر میرے دل نے کہا کہ یہی غیر معروف لوگ ہیں جو دراصل اسلام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ جہاں تک معروف اور مشہور لوگوں کا تعلق ہے انھوں نے تو اسلام کے نام پر اپنی شخصیت کی تعمیر کی ہے نہ کہ خود اسلام کی۔

۲۷ نومبر کو جب میں صبح ۴ بجے سو کر اٹھا تو اچانک خیال آیا کہ اگر دنیا سے ہوائی جہاز کا نظام ختم ہو جائے پانی کے مشینی جہاز بھی موجود نہ رہیں تو میں کیسا بلانکا سے دہلی کس طرح واپس جاؤں گا۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہو جائے تو اتنا دور دراز سفر طے کر کے دوبارہ میرے لئے اپنے وطن واپس پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ اگر میں کسی طریقہ سے واپس روانہ ہوں تو شاید راستہ ہی میں مر جاؤں گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ میرے مرنے کی خبر بھی میرے گھر والوں کو نہ مل سکے گی۔

ہمارے وہ اسلاف کیسے عجیب لوگ تھے جنھوں نے مشینی انقلاب سے پہلے خدا کے دین کو سارے عالم میں پہنچایا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کیا کیا مشقتیں اٹھائی ہوں گی، آج کے ایک انسان کے لئے ان کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں ——— دین کا جو کام انھوں نے محنتوں کے ذریعہ کیا اس کو آج ہم سہولتوں کے ذریعہ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ریاض کے اخبار الشرق الاوسط (۲۸ نومبر ۱۹۸۴) میں ایک مضمون اسرائیل کے بارہ میں تھا۔ اس میں یہ قصہ درج تھا کہ ایک عرب خاتون اسرائیل کے زیر قبضہ علاقہ سے باہر جا رہی تھی۔ سرحد پر ایک واقعہ گزرا جو اخبار کے الفاظ میں یہ تھا:

قال لها الضابط الاسرائيلي، وين رايحة ياهرة (الى اين انت ذاهبة يا امرأة)	اسرائیلی فوجی نے کہا کہ اے عورت تو کہاں جا رہی ہے۔
قالت له انها ذاهبة الى الكويت لزيارة ابنائها۔	اس نے جواب دیا کہ میں کویت جا رہی ہوں، اپنے بچوں سے ملنے کے لئے۔ فوجی نے کہا کہ ان سے میرا سلام
قال لها، سلمى عليهم وقولي لهم سنكون عندهم	کہنا اور ان سے کہنا کہ ہم جلد ہی ان کے یہاں ہوں گے۔

ایک صاحب لندن سے آئے تھے۔ وہ خود تو اردو نہیں جانتے تھے مگر وہ میرے لئے کچھ اردو اخبارات کا تحفہ لائے تھے جو پاکستانی حضرات لندن سے شائع کرتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اخبارات نہیں ہیں بلکہ قوم کی موت کا مرثیہ ہیں۔ دو سرخیاں ملاحظہ ہوں:

۱. جشن میلاد النبی پر لندن میں فرزندان توحید کا فقید المثال جلوس
عاشقان رسول کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر (وطن ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

۲. پاکستان بھارت سے مرعوب نہیں ہوگا۔
بھارت کو فوج کشی کا شوق ہے تو اسے پورا کر کے دیکھ لے (جنگ ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

یہ دونوں سرخیاں ان اخبارات کی شاہ سرخیاں ہیں۔ جس قوم کے دانشور اتنے سطحی ہو جائیں کہ اس قسم کی سرخیوں کے ساتھ اخبار نکالیں اور جس قوم کے عوام اتنے بے شعور ہوں کہ اس قسم کی خبروں اور سرخیوں کو

پڑھ کر خوش ہوتے ہوں ان کو تاریخ کے تھیٹر میں شاید جگہ مل سکتی ہو، مگر حقیقی دنیا میں بہر حال وہ جگہ پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

یہ کانفرنس "اسلام کی عالمی دعوت" کے موضوع پر تھی۔ اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لوگوں پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ اسلامی دعوت خود کیا چیز ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، سب کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے "مشاکل العالم اور مشاکل المسلمین" کے میدان میں کام کرنے کو اسلامی دعوت کا کام سمجھا اور اسی کے بارہ میں تقریریں کیں۔

میں نے اپنے مختصر اظہار خیال میں کہا کہ وہ چیز جس کو "الدعوۃ الاسلامیۃ" کہا جاتا ہے، اس کا تعلق دنیا کے مسائل سے نہیں بلکہ آخرت کے مسائل سے ہے۔ خدا نے جس منصوبہ کے تحت انسان کو پیدا کیا ہے اور اس منصوبہ کے مطابق بالآخر انسان کو جس فیصلۂ الٰہی کا سامنا کرنا ہے اس سے لوگوں کو باخبر کرنا وہ چیز ہے جس کو اسلامی دعوت کہا گیا ہے۔ مسلمان موجودہ دنیا میں جن مشکلوں سے دوچار ہیں یا قومیں جن مسائل میں مبتلا ہیں ان کے سلسلے میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کام کا عنوان دعوت الی اللہ نہیں۔

کانفرنس جس ہال کے اندر ہوئی وہاں جلی حرفوں میں قرآن کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی: یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ میں نے اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آیت کے مطابق عصمت من الناس کو حاصل کرنے کا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے لئے جو یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ظلم و تعدی سے محفوظ نہیں ہیں، وہ اس آیت کے مطابق دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ بذات خود اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کے اصل کام کو جاری کیا جائے۔

ایک صاحب سوئزرلینڈ سے آئے تھے۔ ان کے یہاں انگریزی الرسالہ پابندی سے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی سوئزرلینڈ سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ انگریزی کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ میں اور میرے ساتھی آپ کا میگزین شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں مغز (Substance) ہوتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے انگریزی اور عربی جرائد میں یہی چیز سب سے کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم دنیا کا کوئی بھی پرچہ مجھے نہیں معلوم جس میں اتنا مغز (Substance) ہوتا ہو جتنا آپ کے انگریزی الرسالہ میں ہوتا ہے۔

ایک صاحب گامبیا سے آئے تھے۔ ان کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا تعارفی سٹ (انگریزی) بھیجا گیا

تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کئی لوگوں نے اس کو پڑھا اور اتنا زیادہ پسند کیا کہ ان کو بے حد اشتیاق ہو گیا کہ مصنف کو دیکھیں۔ وہ لوگ مزید انگریزی کتابوں کا شدت کے ساتھ تقاضا کر رہے ہیں۔ ان کے نام الرسالہ انگریزی جاری کر دیا گیا ہے۔

ایک صاحب یوگوسلاویہ سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ دنیا بھر میں پناہ گزینوں (لاجیئن) کی جو تعداد ہے، اس میں ۸۰ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر وہ چیز طاری کر دی گئی ہے جس کو قرآن میں "ذلت و مسکنت" کہا گیا ہے۔ ہم کو گہرائی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں کا یہ حال کیوں ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئے۔

ایک صاحب جو کویت سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کی مسلم تنظیموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیمیں قرآن و سنت کی بنیاد پر اٹھی ہیں اس لئے ان کے پاس اچھے افکار کی کمی نہیں۔ مگر اس دنیا میں صرف فکر کافی نہیں بلکہ نظم اور منصوبہ بندی بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ان تنظیموں کی حالت افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی ممالک اسی لئے ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ منظم انداز سے کام کرتے ہیں۔ اور ہم اس لئے پیچھے ہو گئے ہیں کہ ہمارا کام نظم و ترتیب سے خالی ہوتا ہے (و ما تفوق الغرب منا الا بالنظام و ما تاخرنا منہ الا بالفوضی و عدم النظام)

ایک صاحب جو کناڈا سے آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ کناڈا کی کل ۲۵ ملین آبادی میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کناڈا میں مکمل آزادی ہے۔ کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں ہے۔ وہاں اسلامی دعوت کا کام کرنے کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر ہندستان اور پاکستان کے لوگوں نے وہاں آکر آپس کے مذہبی جھگڑے کھڑے کر دئے ہیں۔ وہاں دوسروں کی طرف سے ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ مگر اپنوں کی طرف سے مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں ایک نئی مسجد بنائی گئی ہے جس کی مالیات کی فراہمی میں میں نے ۸۰ فی صد تک تعاون کیا تھا۔ مگر جب مسجد بن گئی تو اس کے اندر شدید مذہبی جھگڑے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ میں نے اور میری طرح بہت سے لوگوں نے اس مسجد میں جانا ہی چھوڑ دیا۔

انھوں نے بتایا کہ مغرب میں مسلمانوں کی تصویر بہت خراب ہے۔ ان کو امکانی دہشت پسند (Potential terrorists) کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ یہودی پروپیگنڈے کا دخل ہے۔ مگر خود مسلمانوں نے اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور یہ دوسرا پہلو یقیناً زیادہ افسوس ناک ہے۔

رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (ص ۔ ب ۲۴۲، الرباط) ایک ششماہی مجلہ شائع کرتا ہے ۔ اس کے شمارہ ۱۵ میں "کتاب العدد" کے عنوان کے تحت حیات الصحابہ (مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ) پر تبصرہ تھا۔ کتاب کے ابواب کی تفصیل دیتے ہوئے تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ علماء کا قول ہے کہ قرآن کے بعد پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ آپ کے اصحاب کرام ہیں (ان اعظم معجزۃ للرسول بعد القرآن هم صحابته الکرام)

چنانچہ اصحاب رسول کے حالات پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ مگر حیات الصحابہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ مصنف نے زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے صحابہ کی زندگی کو بطور نمونہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جس کی مثال کسی بھی دوسری کتاب میں نہیں ملتی (هكذا عالج سيرة الرسول وصحابته الكرام بطريقة لانجدها في اى كتاب غيره)

تبصرہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ ایک عرب شیخ اپنے طالب علموں کو مستقل طور پر اس کتاب کے مطالعہ پر ابھارتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ : ان هذا الكتاب لم يؤلف على منواله فى بابه یعنی اس موضوع پر اس اسلوب میں اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

ایک صاحب بڑے پرجوش تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل جہاد ہے۔ جہاد سے ان کی مراد قتال تھی ۔ میں نے کہا کہ امت کے رہنما اسی قسم کے جہاد میں تو سو سال سے لگے ہوئے ہیں ۔ پھر مسائل حل کیوں نہیں ہوئے ۔ انھوں نے قرآن سے قتال کی آیتیں پڑھنا شروع کیں ۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے قرآن میں صرف قتال اور جہاد کی آیتوں کو پڑھا ہے انھوں نے قرآن کو پڑھا ہی نہیں ۔ قرآن اعراض کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال مکی دور کی زندگی ہے ۔ قرآن ایڈجسٹمنٹ کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے ۔ قرآن قتال کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال بدر اور احد کے واقعات ہیں ۔ ایسی حالت میں جو لوگ پہلی دونوں قسم کی تعلیمات بھول جائیں اور صرف قتال اور جہاد کی تعلیمات کو زور وشور کے ساتھ پیش کریں، ان کا یہ پیش کرنا ویسا ہی ہے جیسے بہت سے غیر اسلامی ذہن کے لوگ قرآن کی ایک آیت کو لے لیتے ہیں اور اس سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں ۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے جنگجو رہنماؤں کا قرآن کو پانا ایسا ہی ہے جیسے مذکورہ غیر اسلامی لوگوں کا قرآن کو پانا۔

ایک عالی شان ہوٹل تھا ایک بہت بڑے سجے ہوئے کمرہ میں لوگ قیمتی صوفوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے ۔ سگرٹ اور مشروبات پی رہے تھے ۔ بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا ۔ بالکل خاموش میں ایک نشست پر بیٹھا ہوا تھا ۔ ایک صاحب نے مجھے اس

حال میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ ان کے بار بار سوال پر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کا حال دیکھ کر اکثر میرا دل یہ کہنے لگتا ہے کہ: الناس یفرحون لکی لا یفرحوا بعد ذالك ابداً۔ الناس یضحکون لکی لا تیسرلھم الضحك بعد ذالك ابداً۔

ایک موقع پر افریقہ میں قحط اور بھوک کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جو آجکل کی زبان میں "چین اسموکر" تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک قیمتی سگریٹ سلگا رہے تھے۔ انھوں نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا کہ آج کا اصل مسئلہ بھوک نہیں۔ آج کا اصل مسئلہ اسراف ہے۔ عرب دنیا میں آج جس طرح مسرفانہ طور پر خدا کی دولت خرچ کی جا رہی ہے۔ اگر اس کو صحیح ڈھنگ پر خرچ کیا جائے تو ساری دنیا میں بھوک کا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں خاموش بیٹھا ہوا لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو مطمئن چہروں کے ساتھ بھوک کے مسئلہ پر بے تکان بول رہے تھے۔ میرے دل نے کہا۔

" ہر آدمی دوسرے کی کمیوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اپنی کمیوں سے آخری حد تک بےخبر "

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہ بھی شاید ایک عالمی ظاہرہ کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیکنیکل ترقیوں سے پیدا شدہ سنگین مسائل نے بہت سے لوگوں میں یہ ردعمل پیدا کیا ہے کہ وہ "ماضی کی طرف واپسی" کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ انھیں میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کی طرف واپسی کی باتیں کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر مذہب میں کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کی طرف واپسی کی باتیں کرنے لگا ہے۔ مگر یہ سب کچھ بطور فیشن ہے۔ ان میں سے کوئی حقیقی معنوں میں سنجیدہ نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ جو "واپسی" کی باتیں کرتے ہیں ان کا تعلق صرف دوسروں کی واپسی سے ہوتا ہے۔ خود اپنی واپسی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

فاس (Fes) یہاں کا سب سے مشہور تاریخی شہر ہے۔ اس کو ادریس بن عبداللہ نے ۱۷۲ء میں آباد کیا تھا۔ اس وقت یہاں اسلام عمومی طور پر نہیں پھیلا تھا۔ ادریس بن عبداللہ جو سیاسی دار و گیر سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ انھوں نے اپنی دعوتی کوششوں سے تقریباً پورے ملک کو مسلمان بنا ڈالا۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۴ کو فاس کا سفر ہوا۔ صبح کے وقت کانفرنس کے شرکا خصوصی طیارہ کے ذریعہ کیسا بلانکا سے فاس لے جائے گئے۔ اور اسی دن شام کو کیسا بلانکا واپس آ گئے۔ فاس کا شہر کیسا بلانکا سے بذریعہ ہوائی جہاز پون گھنٹہ کی مسافت پر ہے

فاس قدیم زمانہ میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے۔ مشہور ہے

کہ ایک شخص کی عالمانہ باتوں کو سن کر کسی نے اس سے پوچھا : کیا تم نے فاس میں علم حاصل کیا ہے ۔ اس نے کہا نہیں علم آدمی کے سر میں ہوتا ہے نہ کہ شہر فاس میں (ھل تعلمت فی فاس ۔ قال لا ۔ العلم فی الراس لا فی الفاس)

جدید فاس موجودہ زمانہ کے شہروں کی طرح ہے ۔ مگر قدیم فاس تاریخی آثار سے بھرا ہوا ہے ۔ سڑکوں سے گزرتے ہوئے متعدد مسجدیں دکھائی دیں ۔ یہاں کی مسجدوں کا طرز بالکل مختلف ہے ۔ مینار صرف ایک ہوتا ہے جو ایک کونہ پر بنایا جاتا ہے ۔

فاس مکمل طور پر ایک تاریخی شہر معلوم ہوتا ہے ۔ یہاں قدیم طرز کی عمارتیں ، شاہانہ نشست گاہیں ، اور قلعے اس کی گزری ہوئی عظمت کی یاد دلاتے ہیں ۔ یہاں کی مشہور جامعۃ القرویین بھی دیکھی ۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں یونیورسٹی کے انداز پر بنائی گئی تھی ۔ یہاں عظیم الشان مدرسہ اور اس کے ساتھ عظیم الشان مسجد ہے ۔ قدیم زمانہ میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی گھڑیاں ، اصطرلاب وغیرہ آج بھی سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں ۔ تعمیرات قدیم اسپینی محلات کے طرز کی نظر آئیں ۔

ہمارے گائڈ نے جامعۃ القرویین کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس تعلیم گاہ کا معیار اتنا بلند تھا کہ یہاں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جس کو مہارت حاصل ہو (ولا یدخل فی ھذا المرکز الا من کان لہ مھارۃ العلم) یورپ کے آئے ہوئے ایک صاحب سے میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا :

The glory which was Islam, has now become a tourist attraction.

جو چیز ماضی میں اسلام کی عظمت تھی وہ آج صرف سیاحوں کی دل چسپی کا مرکز بن کر رہ گئی ہے ۔

ہم نے جمعہ کی نماز یہاں کی قدیم جامع مسجد میں پڑھی ۔ اس کا طرز تعمیر بالکل وہی تھا جو اسپین کے الحمرا میں پایا جاتا ہے ۔ فاس میں یہودیوں کا بھی ایک محلہ موجود ہے ۔ یہ لوگ پہلے قدیم فاس میں تھے اب وہ جدید فاس میں آباد ہو گئے ہیں ۔

اس سفر کی ایک "دریافت" روم ایرپورٹ کے ایک اطالوی افسر تھے ۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Mr. Marchetti,
Bartolomeo, Via Scarperia 9, 00146 Rome, Italy

انھوں نے جاتے ہوئے اور واپسی میں روم ایرپورٹ پر غیر معمولی تعاون کیا ۔ ساری تفصیل بیان کرنا مشکل ہے ، صرف دو باتوں کا تذکرہ مناسب ہوگا ۔ دہلی سے روم کے سفر میں ایر انڈیا کی بوئنگ ۷۴۷ کی اکانومی کلاس اگرچہ بڑی حد تک بھری ہوئی تھی ۔ مگر ۱۶ سیٹ کے فرسٹ کلاس کیبن میں میں اکیلا مسافر تھا ۔ مگر واپسی

میں عجیب صورت پیش آئی۔ میرا رزرویشن روم سے کنفرم نہیں تھا۔ اور آج اتفاق سے گورنمنٹ آف انڈیا کے افسروں کی ایک جماعت اسی جہاز سے سفر کر رہی تھی، اس لئے بظاہر سیٹ حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر مسٹر بار شیٹی دوبارہ مل گئے انھوں نے مجھ کو لاونج میں بٹھا دیا اور میرا ٹکٹ لے کر ایر انڈیا کے دفتر میں گئے اور رزرویشن کنفرم کرا کر لے آئے۔

میری واپسی کی تاریخ کی دہلی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ ان سے میں نے ذکر کیا تو فوراً انھوں نے میرا ٹیلیفون نمبر لیا اور کہا کہ ابھی میں دہلی کو ٹیلکس بھیج دیتا ہوں کہ آپ کے گھر پر اطلاع دے دی جائے کہ آپ اتوار کی صبح کو ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۳۱ سے دہلی پہنچ رہے ہیں۔

مسٹر شیٹی نے جس اخلاق اور ذمہ داری کا ثبوت دیا وہ اس قدر معیاری تھا کہ مجھے تعجب ہوا کہ خود غرضی اور سطحیت کی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ موصوف کے نام الرسالہ (انگریزی) اعزازی طور پر جاری کر دیا گیا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴ کو کیسابلانکا سے واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ الیتالیا (۸۲۵) پر سفر کرتے ہوئے لندن کے اخبار ڈیلی گراف (۲۹ نومبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر پڑھی کہ آکسفورڈ کے ۳۲ سالہ جان لیمبرٹ (John Lambert) نے اپنی تین لڑکیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی کے نام آخری خط میں لکھا تھا کہ تم نے مجھ کو ایک محبت کرنے والے وفادار شوہر سے بدل کر قاتل بنا ڈالا۔ میں ہر چیز کا الزام صرف تم کو دیتا ہوں قاتل پکڑا گیا۔ اس کے بعد اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

It's all to do with my wife going with other men.

ادھیاتمک فاؤنڈیشن ایک ہندو مشن ہے جس کے صدر ڈاکٹر سوامی پورن ہیں۔ ان کا بہت بڑا مرکز سوئزرلینڈ میں قائم ہے۔ نیز دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں ہیں۔ ڈاکٹر سوامی پورن کا ٹیلیفون کئی بار صدر اسلامی مرکز کے نام آیا کہ وہ موصوف سے ملنا چاہتے ہیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ کی شام کو نئی دہلی کے ہوٹل سنٹور (سوئٹ نمبر ۲۰۲۵) میں سوامی جی اور صدر اسلامی مرکز کے درمیان تفصیلی ملاقات ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو میں دونوں کے درمیان تبادلہ خیال ہوا۔ گفتگو کا موضوع خاص طور پر یہ تھا کہ "سچائی" کیا ہے اور وہ کون سا معیار (کرائٹیرین) ہے جس سے جانچ کر کسی سچائی کا سچائی ہونا معلوم کیا جاسکے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس طرح کی ملاقاتوں کا پروگرام دہلی کی دوسری مذہبی اور روحانی شخصیتوں کے ساتھ بھی بنایا جائے گا۔

۲. انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ تقریباً ہر روز کسی نہ کسی حلقہ کی طرف سے اس کی مثال سامنے آتی ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۵ کو اچانک مصری سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی مسٹر الطیب حفنی اسلامی مرکز آئے۔ انھوں نے کہا کہ کل میں نے آپ کے انگریزی الرسالہ کا ایک اشو دیکھا۔ مجھ کو وہ اتنا پسند آیا کہ میں آپ سے ملنے اور مرکز دیکھنے کے لئے آگیا۔ انھوں نے الرسالہ کے پیغام سے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا۔ ان کو عربی اور انگریزی مطبوعات کا ایک سٹ بطور ہدیہ دیا گیا۔

۳. ایس آئی ایم کے اجلاس (اکتوبر ۱۹۸۴) کے موقع پر نئی دہلی (رام لیلا گراؤنڈ) میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا تھا۔ اس موقع پر ایک رجسٹر بھی رکھا گیا تھا۔ اس رجسٹر میں بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ یہاں ان میں سے صرف ایک تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

'The Introduction to Islam Series' publications have been found useful but it was observed that these are printed in English and Urdu languages only. With the view-point of the propagation of Islamic teachings all the useful handbook or book-let should also be released in the rest of the modern Indian languages. On the whole, the rest of the publications displayed here are excellent and bearing the upto date information about Islam. Thanks for the endeavour in this regard.

Chander Mohan, D-917, Netaji Nagar, New Delhi 23

۴. ۳۰ دسمبر ۱۹۸۴ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول شام کو بعد نماز مغرب اسلامی مرکز کا ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے حم سجدہ (آیت ۵۳) اور النمل (آیت ۹۳) کی روشنی میں

۴۵ منٹ کا درس دیا۔ ان آیات میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا آئندہ ایسی نشانیاں ظاہر کرے گا جن سے لوگ قرآن اور قرآنی تعلیمات کی صداقت کو جان لیں گے۔ موصوف نے آیات کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز نزول قرآن کے وقت ایک الہامی خبر معلوم ہوتی تھی وہ بعد کے دور میں خود انسانی علوم کے ذریعہ ثابت شدہ بن جائے گی۔ اس بات کو مختلف علمی اور تاریخی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا۔ اس درس کا ٹیپ لے لیا گیا ہے اور وہ اسلامی مرکز میں محفوظ ہے۔

الرسالہ کی تحریک خدا کے فضل سے لوگوں کے دلوں میں تاثیر پیدا کر رہی ہے۔ جگہ جگہ اس کے حلقے قائم ہو رہے ہیں۔ اور لوگ خالص دینی جذبہ کے تحت اس تعمیری مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی اپنی زندگیوں میں انقلاب آ رہا ہے جس کا اندازہ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۵ کو ایک صاحب نے صدر اسلامی مرکز سے کہا ——— "میں ایک انانیت پسند آدمی تھا مگر الرسالہ نے میری انا کو مجھ سے چھین لیا۔ میں جہنم کے رخ پر کھڑا تھا، الرسالہ نے مجھ کو جنت کے رخ پر کھڑا کر دیا۔"

اسلامی مرکز کی تحریک اب تک زیادہ تر مطبوعات اور اجتماعات کے ذریعہ چل رہی تھی۔ اب اس میں انشاء اللہ کیسٹ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بہت جلد انشاء اللہ صدر اسلامی مرکز کی تقریروں کے کیسٹ بڑے پیمانہ پر فراہم کئے جا سکیں گے۔ اس سے تحریک کی وسعت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ بھی اس کے دائرہ دعوت میں آ جائیں گے جو اردو سمجھتے ہیں مگر وہ اردو پڑھ نہیں سکتے۔

الرسالہ اردو اور انگریزی میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب انشاء اللہ اس کا عربی اور ہندی اڈیشن بھی زیر تجویز ہے۔ اور اس کے لئے ایک آفسٹ پریس کا قیام عمل میں لانا طے کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ تعاون فرمائیں وہ اللہ تعالےٰ کے یہاں انشاء اللہ اس کا اجر پائیں گے۔

خدا کا فضل ہے کہ اسلامی مرکز کے لٹریچر کا وزن اب ملحدانہ ادارے بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ مولانا محمد ہاشم القاسمی نے حیدر آباد سے اطلاع دی ہے کہ اردن کا ایک وفد حیدر آباد آیا تھا۔ اس کے دو ارکان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اشتراکی روس نے کتاب الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) پر قانونی پابندی عائد کر دی ہے۔ روس جانے والا کوئی شخص اس کتاب کو لے کر روس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ روس میں اس کتاب کی فروخت اور اشاعت کی اجازت حاصل نہیں ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متنوع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ ... دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

Number 99
February 1985

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	15/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدیدِ دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-

سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	3/-
آخری سفر	3/-
حقیقتِ حج	2/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-

تعارفی سیٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

English Publications

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ ، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳